رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۹۰ عدد ۳

جون ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

اسلام کا نظامِ عدل

از ـــــ استاذ سید قطب (مصر)

ترجمہ ـــــ محمد نجات اللہ صدیقی ایم۔ اے

ایک ایسی کتاب جس نے عرب، یورپ اور امریکہ میں اپنی دھوم مچا دی۔

ـــ جس کو عربی، انگریزی اور فرنچ کے بعد اردو میں پیش کیا جا رہا ہے ـــ

- اسلام کے معاشی نظام پر ایک معرکتہ الآرا کتاب ـــ
- موجودہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کا موازنہ ـــ
- اسلام میں تقسیم دولت کا نظام ـــ
- اسلام میں عدل اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا انتظام ـــ
- مسلمانوں کے لئے نئے نظام تعلیم کا خاکہ اور تجاویز ـــ
- اسلامی نظام کے داعیوں کے لئے دعوت غور و فکر ـــ

معاشیات کے طالب علموں کے لئے مخصوص اہمیت کی حامل کتاب۔

ضخامت ۲۲×۱۸ / ۸

صفحات ـــ ۴۸۰

معیاری کتابت و طباعت

دیدہ زیب گرد پوش

قیمت دس روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۔ ۱۱۔سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۰ | جون ۱۹۶۳ء | عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس کرہ ارضی پر جن افراد یا قوموں نے خداوند تعالیٰ سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کی ہے انہیں قدرت نے مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کیا ہے لیکن عذاب کی بے شمار نوعیتوں میں ایک چیز ہمیشہ قدرِ مشترک کی حیثیت سے نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے باغیوں نے جب بھی بغاوت پر اصرار کیا تو سب سے پہلے اُن کی عقلوں پر پھٹکار پڑی اور اُن کے اندر صحیح طرزِ فکر اور صحیح طرزِ استدلال کی صلاحیتیں یکسر ختم ہو کر رہ گئیں۔ شیطان نے ان کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو اس طرح بدلا کہ باطل ان کے سامنے حق کی حیثیت سے جلوہ گر ہوا اور حق انہیں ہمیشہ باطل ہی نظر آیا۔ غالباً قلب و دماغ کی اسی افسوسناک کیفیت کو قرآن مجید نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(الانعام ۴۳)

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے انہیں اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔

قرآن مجید نے گمراہ قوموں کی جس بدنصیبی کی طرف اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں اشارہ فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ انہیں بار بار جھنجھوڑا جاتا ہے لیکن ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ انہیں قدم قدم پر تنبیہ کی جاتی ہے لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انہیں ٹھوکروں پر ٹھوکریں لگتی ہیں لیکن یہ بیدار نہیں ہونے پاتیں۔ ہر چوٹ اُن کے اندر اضطراب اور پریشانی کی ایک لہر تو دوڑا دیتی ہے اور وہ اس افسوسناک صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے قدرے بے چین بھی ہوتی ہیں لیکن شیطان انہیں بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے یہ اطمینان دلا دیتا ہے کہ تمہارے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں قطعاً کوئی لغزش اور خامی نہیں تم جس راہ پر گامزن ہو وہی درحقیقت کامرانی اور فلاح کی راہ ہے اس لیے تم آنکھیں بند کرکے اسی پر بگٹٹ بھاگتے چلے جاؤ۔

آپ اگر اُن اقوام کے حالات کا جائزہ لیں جن پر مغربی تہذیب کا عذاب مسلط کیا گیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علمی ترقی اور ذہنی نشو ونما کے بلند بانگ دعووں کے باوجود جتنی فکری کجی اُن کے ہاں پائی جاتی ہے اتنی بہت کم قوموں کے اندر دیکھنے میں آتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مختلف مصائب سہنے کے باوجود اُن کی عقل ٹھکانے نہیں آتی۔ انسانوں کے کسی گروہ کے لیے اس سے زیادہ تشویشناک صورت اور کیا ہو سکتی ہے کہ قدرت کی جن جن قوتوں کو انہوں نے بڑی محنت سے مسخر کیا ہے وہ اُن کی خدمت اور چاکری کی بجائے اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے والے دماغ اس پریشان کن حالت کو دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہیں لیکن اُسی راستے پر چلنے کے لیے بضد ہیں جس نے انہیں اس حسرتناک انجام تک پہنچایا ہے۔ وہ اپنے حشر کو محض بخت و اتفاق کی کرشمہ سازیاں کہکر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اُن کا مغرورانہ احساس انہیں کبھی یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کرتا کہ علم وفن کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اُن کی زندگی اُن کے لیے جس طرح عذاب بن گئی ہے وہ اُن کے غلط کار طرزِ فکر کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔

یوں تو یورپ کی پوری زندگی ان منطقی مغالطوں سے بھری پڑی ہے لیکن اس وقت ہمارے سامنے کیلر کا وہ سکینڈل ہے جس نے برطانیہ کے وقار کو اس شدت کے ساتھ مجروح کیا ہے کہ اُس کا ہر شہری اس "سانحہ" پر تلملا اٹھا ہے۔ بڑے سے بڑے فلسفی سے لیکر معمولی سے معمولی خوانچہ فروش تک کے حواس باختہ ہیں اور ہر شخص اس واقعہ پر حیرت کی تصویر بنا جا رہا ہے۔ انگلستان کا شاید کوئی حلقہ ایسا ہو جس میں اس پر گہری تشویش کا اظہار نہ کیا جا رہا ہو۔ اس ساری تشویش اور پریشانی کے اندر اللہ کا کوئی بندہ ایسا نہیں جو فساد کے اصل مرکز کو تلاش کرنے کے لیے کسی طرح بھی فکرمند نظر آتا ہو۔ اہلِ فرنگ کی ساری توجہ صرف اس واقعہ کے سیاسی پہلو کی طرف سمٹ کر رہ گئی ہے اور یہ شرمناک حادثہ جن اسباب کا قدرتی نتیجہ ہے وہ اُن کی آنکھوں سے یکسر اوجھل ہیں

آگے بڑھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اصل واقعہ بیان کر دیں:

"انگلستان کے وزیرِ جنگ نے ایک فاحشہ عورت کیلر سے تعلقات استوار کیے۔ اسی زمانے میں جبکہ وزیر صاحب اس کے دامِ اُلفت کے اسیر تھے اس فاحشہ نے روسی سفارت خانے کے ایک جاسوس سے بھی تعلقات قائم کر لیے وہ آدمی جس کی زیرِ نگرانی یہ دو رویہ تعلقات تشکیل پاتے رہے وہ سوویٹ یونین کا دلال تھا۔ فاحشہ کیلر اور وزیرِ جنگ پروفیومو کو اکٹھا کرنے کا مقصد جنگی رازوں کی جستجو اور ان کا حصول تھا تاکہ وہ انہیں اپنے کمیونسٹ مالکوں تک پہنچاتے۔ اس پر مستزاد برطانوی نقطۂ نظر سے قبیح ترین جرم یہ سرزد ہوا کہ پروفیومو نے پارلیمنٹ میں عائد کردہ الزامات کی تردید میں فاش جھوٹ بولا یہ جھوٹا اور بدکار وزیر پریوی کونسل کا رکن ہے جس کی رکنیت دائمی ہے اور اس سے کبھی استعفا نہیں لیا جا سکتا[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام دستوری روایات جن پر برطانوی فخر و مباہات کا انحصار ہے

[1] اب اس نے چلک کے دباؤ سے خود استعفا دیا ہے۔

معرضِ خطر میں پڑ گئی ہیں۔ اور اس واقعہ کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس لکھنا ؤنے عشق اور تباہ کن سازش کی تمہید اُس محل کلاؤوڈون میں پڑی جو اُن بادشاہ قدامت پرستوں کا صدر مقام ہے جنہوں نے اخلاقی گراوٹ کے الزام میں ایڈورڈ ہشتم کو ملک بدر کیا تھا۔"

(نوائے وقت مورخہ ۱۹ جون)

یہ بحران خواہ انگریزی قوم کے لیے کتنا ہی تکلیف دہ اور اندوہناک ہو لیکن واقعہ کے اعتبار سے اس میں کوئی چیز بھی حیرت انگیز نہیں۔ مغربی تہذیب کے ان معماروں نے اپنے تمدن کی تشکیل جس انداز پر کی ہے اُس میں آزاد شہوت رانی کو بطورِ اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ اُن کے یاں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے صنفی میلانات کی تسکین کے لیے جس عورت کی طرف چاہے رجوع کرے اور اگر اُسے کوئی اعتراض نہ ہو تو حکومت اس پر کسی طرح بھی معترض نہیں ہو سکتی۔ ایک خدا ناشناس تمدن جس میں کسی علیم و خبیر ذات پر ایمان محض ایک وہم سمجھا جاتا ہے، جس میں حشر و نشر اور آخرت کی جواب دہی کو محض اعتباری باتیں سمجھ کر اُن کا مذاق اڑایا جاتا ہے، جس میں انسان کے سفلی جذبات کو بھڑکانے کا پورا پورا التزام موجود ہو، وہاں کسی وزیر صاحب کا کسی فاحشہ سے رابطہ قائم کر لینا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اس قسم کے معاشقے تو وہاں کے روزمرہ معمولات میں سے ہیں۔ اور اونچی سے اونچی شخصیت سے لے کر معمولی سے معمولی انسان تک سب اُس میں ملوث ہیں۔ یہ اُن کی زندگی کا معمول ہے جس میں انہیں حیرت کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ البتہ جو لوگ اس "فطری طرزِ عمل" کے خلاف انسانوں پر کچھ حدود و قیود عائد کرنے کے حق میں ہیں وہ اُن کے نزدیک کم ظرف، جاہل، رجعت پسند، دشمنِ انسانیت اور اس وجہ سے [illegible] گردن زدنی ہیں۔

انگریزوں کو جو چیز آج کھائے جا رہی ہے وہ پروفیومو کا فسق و فجور نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ اُس نے وزیرِ جنگ کی حیثیت سے ایک ایسی فاحشہ سے تعلقات قائم کیے جس کے روسی سفارتخانے

کے ایک اتاشی سے بھی تعلقات موجود تھے اور اس طرح انگلستان کے جنگی راز اُس کے دشمن کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ پھر اُس برطانوی وزیر نے اپنی قومی روایات کے بالکل برعکس پارلیمنٹ کے اندر عائد کردہ الزامات کی تردید میں خالص جھوٹ بولا۔

اس "سکینڈل" پر قوم کے اندر جو شدید ردّعمل ہوا اس کے بارے میں ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں جو خبریں آرہی ہیں اور اس پر مختلف حلقوں میں جو تبصرے ہوتے ہیں اُن کا اگر آپ جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صرف چند مستثنیات کو چھوڑ کر وہاں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا ہو کہ یہ جو کچھ ہوا ہے وہ ہمارے مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور اپنے رب سے باغیانہ طرزِ عمل کا فطری نتیجہ ہے۔ پُوری قوم کو صرف یہی فکر لاحق ہے کہ ہمارے جنگی راز روس کو معلوم ہوگئے ہیں، امریکہ میں بالخصوص فوجی رازوں کی حفاظت کے معاملہ میں ہمارے متعلق پہلے سے جو بدگمانیاں موجود تھیں انہیں تقویت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر ہمارے وقار پر ضرب کاری لگی ہے اور ہم دنیا میں عزت و احترام کا وہ بلند مقام کھو چکے ہیں جو ہمیں کبھی حاصل تھا۔ یہ ہے وہ محور جس کے گرد برطانوی قوم کے خیالات اور احساسات مسلسل گھوم رہے ہیں۔ اس ایک محور سے ہٹ کر اہلِ فرنگ کسی دوسری چیز پر غور کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اُن کی اس کوتاہ بینی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان اسباب کو سمجھنے سے قاصر ہیں جنہوں نے ان نتائج کو جنم دیا ہے۔ اُن کی نظریں ہر پھر کر اس معاملہ کے صرف سیاسی پہلوؤں کی طرف مبذول ہوتی ہیں اور وہ یہ دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں کہ اس وزیر کی حماقت کی وجہ سے ملک اور قوم کی ساکھ کو دھچکا لگا ہے اور وہ پوری دنیا کی تضحیک کا ہدف بن رہی ہے۔

کسی قوم پر اس سے بڑا عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس کی عقل کو اس دردناک قومی حادثہ کے چند سطحی اور غیر ضروری پہلوؤں میں الجھا دیا جاتے اور فتنہ و فساد کا حقیقی منبع تلاش کرنے کے لیے اُن کے اندر کوئی تمنّا اور آرزو پیدا نہ ہو اور وہ اسے ایک وزیر کی ایک شرمناک اور

غیر ذمہ دارانہ مگر اتفاقی حرکت سمجھ کر خاموش ہو جائیں۔ ان عقل کے اندھوں کو اتنی سادہ سی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ جو برق اُن کے ملک اور قوم پر گری ہے اور جس نے اُن کی ساکھ کو بالکل بھسم کر کے رکھ دیا ہے، یہ دفعتاً کسی نیلے آسمان سے ایک کر تو نہیں آئی۔ باطل افکار و نظریات کی جو آندھیاں برسوں سے اس ملک کے اندر چل رہی تھیں اور فسق و فجور کی جو تاریک گھٹائیں اس کے افق پر چھا رہی تھیں وہ ہر لمحہ اس آنے والے خطرے کی دہائی دے رہی تھیں لیکن عقل و وجدان کے مسلوب ہو جانے کی وجہ سے وہ اس کی ہلاکت خیزیوں کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ اگر ان کے دل و دماغ بالکل ماؤف نہ ہوتے تو انہیں اس واقعہ پر حیرت زدہ ہونے کی بجائے حیرت اس بات پر ہوتی کہ اُن پر یہ بلا اتنی دیر سے کیوں نازل ہوئی ہے۔

یہ حادثہ کوئی ایسا نہیں جس کے تجزیہ کے لیے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت ہو۔ یہ واقعہ خدا سے بغاوت اور سرکشی، آخرت کی بازپرس کے بارے میں عدمِ یقین، مذہب اور اس کے پیش کردہ نظامِ اخلاق سے روگردانی کا بالکل فطری ثمرہ ہے۔ جب آپ ایک شخص کے دل و دماغ میں اس باطل خیال کی آبیاری کرتے ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک نہیں، اس کا کوئی فرمانروا اور آقا نہیں، اور یہ محض بالکل اتفاقی طور پر اندھے بہرے لزوم کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آگئی ہے تو اس کے اندر کوئی پائیدار اخلاقی حس کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آپ جارحانہ وطن پرستی کے نشہ میں سرشار کر کے اسے کسی بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر لیں اور وہ کسی وقتی جوش اور ہیجان کے اندر کسی اچھے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن اس کیفیت کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ جس وقت اُس کا نشہ اترے گا اُس سے اسی وقت نہایت گھٹیا قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔

انسانی زندگی ایک "اکائی"، ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کے سارے شعبے اُس

بنیادی نقطۂ نظر کے مطابق تشکیل پاتے ہیں جسے انسان دل کی گہرائیوں میں پرورش کرتا ہے۔ اگر اس کا یہ نقطۂ نظر صحیح اور درست ہو تو اس کا ضمیر اور وجدان بھی صحیح ہوتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی کے سارے گوشے بالکل صحت مند ہوتے ہیں، لیکن اگر اس کا بنیادی نقطۂ نظر غلط ہو تو پھر عقل اور وجدان دونوں غلط انداز پر کام کرتے ہیں اور اس طرح اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں میں اختلال اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو انسانیت کے سب سے بڑے ہادی اور عارفِ ربانی نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

ان فی جسد الانسان مضغۃ اذا فسدت فسد الجسد کلہ واذا صلحت صلح الجسد کلہ الا وھی القلب۔	انسانی جسم کے اندر گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ جب اُس میں کوئی فساد پیدا ہو جائے تو پورے جسم میں فساد پیدا ہو جاتا ہے اور جب وہ صحیح اور درست ہو جائے تو جسم کے پورے نظام میں صحت اور درستی آجاتی ہے اور وہ دل ہے۔

اہلِ مغرب کی بنیادی خامی یہ ہے کہ انہوں نے آج تک اس واضح حقیقت کو نہیں سمجھا۔ ایک شخص جس کے دل و دماغ میں یہ باطل خیال پوری طرح راسخ ہو چکا ہے کہ زندگی کا اصل مقصد حسی لذات اور مادی خواہشات کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں، اُس سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی اعلیٰ اور ارفع مقصد کی خاطر انہیں قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا محض ابلہ فریبی ہے جس انسان کی غایت الغایات نفس کی پرستش ہو وہ اس سے بلند ہو کر کبھی کچھ سوچ ہی نہیں سکتا اور اگر وہ کسی وقت اس کے برعکس کسی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے تو یہ محض اس کی دیوانگی کا اظہار ہے۔ اُس کے لیے صحیح اور سیدھی راہ یہی ہے کہ وہ ہر حال میں نفس کی غلامی اختیار کرے اور اس مسلک کو ہر دوسرے مطالبے پر ترجیح دے۔

ہمیں اُن لوگوں کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جو بڑے طمطراق سے یہ کہتے ہیں کہ ہمیں کسی شخص کے ذاتی کردار سے کوئی تعلق نہیں ہمیں صرف اس کی پبلک لائف سے سروکار ہے اور ہمارے لیے دیکھنے کی چیز صرف یہی ہے کہ اُس کی اس زندگی سے ملک اور قوم کو کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے ان حضرات کو اپنی فکری اور علمی برتری پر بڑا ناز ہے لیکن وہ ابھی تک اس سادہ سی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے کہ جو شخص اپنی ذاتی زندگی میں غیر ذمہ دار اور بد اخلاق ہے وہ پبلک لائف میں آخر کس طرح با اخلاق اور ذمہ دار بن سکتا ہے۔ انسانی سیرت کوئی ریکارڈ آفس نہیں جس میں اچھے بُرے ریکارڈ کی مختلف فائلیں الگ الگ خانوں میں محفوظ رکھ لی جائیں اور جب جس قسم کی فائل کی ضرورت ہو اُسے نکال کر پیش کر دیا جاتے سیرت و کردار درحقیقت ایک خاص نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کا عملی اظہار ہے جس کے تحت ایک انسان پر حالات و واقعات کا خاص ردِ عمل ہوتا ہے جس انسان کا بنیادی تصور غلط ہوگا اُس کا انفرادی اور اجتماعی اخلاق بھی یکسر ناقابلِ اعتماد ہوگا۔ اسی طرح جس شخص کے اساسی نظریات بالکل صحیح اور درست ہونگے۔ اُس کی انفرادی سیرت اور اجتماعی کردار بھی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوگا۔ جب پروفیومو کے لیے نفس پرستی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ٹھیرا تو اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ اس کے اس طرزِ عمل سے ملک اور قوم کو کیا نقصان پہنچا ہے۔ وہ اگر پریشان ہے تو صرف اس وجہ سے کہ لوگوں نے اس کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے اور اُن کی قوم اگر مضطرب ہے تو محض اس لیے کہ پوری دنیا میں اُس کی رسوائی ہوئی ہے۔ وزیرِ جنگ کا معاشقہ بجائے خود کسی لحاظ سے بھی انگریزی قوم کی نظر میں قابلِ مواخذہ نہیں۔

انسانی قلب جو اخلاق کا واحد سرچشمہ ہے وہ اگر گدلا ہو جائے تو اس سے سیرت و کردار کو سیراب کرنے والے افکار و احساسات کے سارے دھارے بھی گدلے ہو جاتے ہیں اور پھر انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہتا جس میں یہ جراثیم پوری طرح سرایت نہ کر جائیں۔ سائنس کے حیرت انگیز انکشافات اور علم النفس کے وسیع تجربات تقطیر کا کوئی آلہ اور

تطہیر کا کوئی ایسا اصول وضع نہیں کر سکے جن کی مدد سے انفرادی زندگی کے گدلے دھاروں کو حیاتِ اجتماعی کی کشت کو سیراب کرنے وقت پوری طرح پاک اور صاف کیا جا سکے۔ اس دھارے میں جس قسم کی غلاظتیں شروع میں شامل ہو جائیں وہ جلد ہی اس کے اندر تحلیل ہو کر اُس کا جزو بن جاتی ہیں اور پھر انسان کی پوری زندگی کو یکسر ناپاک بنا دیتی ہیں۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فطرت نے کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی۔ ہماری انفرادی زندگی کا ہر گوشہ ہماری حیاتِ اجتماعی کی بنیاد اور اساس ہے اور اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ ہمارے انفرادی کردار کا شارح اور ترجمان ہوتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا پیمانہ موجود نہیں جس کی مدد سے ہم انفرادی زندگی کی وسعتوں کی پیمائش کر کے اُن کے گرد فصیل کھینچ سکیں تاکہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعلق باقی نہ رہے اور ہم بڑے اعتماد کے ساتھ ان دونوں کے اندر دو مختلف طرزِ عمل اختیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہم جو چاہیں کہتے رہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انفرادی زندگی کو اجتماعی کردار کے اثرات سے کسی طرح بھی محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور اسی طرح اجتماعی طرزِ عمل کو انفرادی سیرت سے کسی طریق بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے انفرادی اعمال اور اجتماعی افعال دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور دونوں ہمارے بنیادی تصورِ حیات کے رُخِ زیبا کا عکس ہیں۔

انہوں نے اپنا سارا زور اس بنیادی تصور کی اصلاح کرنے میں صرف کیا۔ اللہ کے یہ پاکباز بندے اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہیں کہ بندے کا اگر اپنے خالق اور مالک کے ساتھ تعلق درست ہو جائے تو پھر زندگی کے باقی شعبے خود بخود درست ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اس تعلق میں کوئی کجی رہ جائے تو اصلاحِ حال کی ساری کوششیں بالکل ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ دنیا میں جتنے انبیاء علیہم السلام بھی تشریف لاتے انہوں نے انسانیت کے سامنے

اسی بنیادی حقیقت کی وضاحت فرمائی اور اس کے اندراس کا صحیح شعور اور ادراک پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کی۔ ان سب کا پیغام صرف ایک ہی ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ - اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ - هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ - (آل عمران - ۵۰)	اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ لہٰذا تم اُسی کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے

پرفیومو اور کیلر کے اس معاشقے کے اندر انسانیت کے ہر بہی خواہ کے لیے عبرت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ فرنگ کو اس قدر شدید چوٹ سہنے کے بعد بھی اس امر کا قطعاً احساس نہیں ہوا کہ وہ اپنی اُن بنیادوں پر غور کریں جن پر انہوں نے اپنی معاشرتی اور عائلی زندگی تعمیر کی ہے۔ یہ واقعہ کوئی اچانک تو رونما نہیں ہوا۔ ایک ایسا ملک جس میں ہر سولہ میں سے ایک بچہ ناجائز ہو جس میں غیر شادی شدہ مائیں ہر سال چھپن ہزار بچے پیدا کر رہی ہوں۔ جہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان میل جول کی پوری آزادی ہو وہاں اگر ایک وزیر باتدبیر کسی عورت کے عشق میں گرفتار ہو کر کوئی قبیح حرکت کر بیٹھیں تو اس پر اتنی غوغا آرائی کچھ عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے۔ اس معاملے میں بھی ان کی بنیادی لغزش یہی ہے کہ وہ اس "انجام بد" پر تو سخت ہراساں ہیں لیکن معاشرتی زندگی کے جس فلسفہ نے انہیں ان مہیب غاروں کی طرف دھکیلا ہے اُس میں انہیں قطعاً کوئی سقم نظر نہیں آتا اور اس وجہ سے وہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ کامن ویلتھ پریس کے حالیہ سالانہ اجلاس میں لارڈ شاکراس نے کرشاین کیلر کے قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے جو تقریر کی ہے وہ اسی کوتاہ بینی کی نہایت واضح دلیل ہے۔ ہم ذیل میں اُس کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں جس سے ہمارے رُخ کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

"مغربی معاشرے میں غیر صحت مند رجحانات کے فروغ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے جنس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ ہمارا معاشرہ مسرتوں کا

گہوارہ بن جاتے اگر ہم جنس کے مسئلے پر بحث کرکے اسے پیچیدہ سے پیچیدہ تر نہ بنائیں۔ میری رائے میں جنسی معاملات میں مغربی دنیا اس حد تک الجھ چکی ہے کہ رومتہ الکبریٰ کے دورِ زوال کی حالت بھی قدرے بہتر ہوگی۔ اپنے ہاں کے رسالوں اور کتابوں میں چھپنے والی تصویریں ملاحظہ کیجیے۔ کہیں حسن ذوق نظر نہیں آئے گا البتہ جسمانی لذت، شہوانیت اور حیوانیت کے مظاہر دکھائی دیں گے"۔

"انگلستان کی کلبوں نے تو بے مقصد اور ہیجان خیز جنسیت کے مظاہروں کی انتہا کر دی ہے۔ یہاں رقص کی ایسی برہنہ کلبیں ہیں جن میں انسانیت سوز حرکات کی جاتی ہیں۔ اکثر کلبوں میں لوگ جنسی اذیت رسانی کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کج رویوں میں اگر ناتجربہ کار نوجوان مبتلا ہوں تو یہ بات کچھ سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ لندن کے بدنام ترین علاقہ "سوہو" میں ایسی کلبوں کی سرپرستی ادھیڑ عمر کے خوش حال لوگ کرتے ہیں۔

ہم لوگ فلموں میں رومتہ الکبریٰ کے زمانے کے سنگدل تماشائیوں پر حیران ہوتے ہیں جو عورتوں اور مردوں کو وحشی درندوں کے جبڑوں میں لٹکا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن "تہذیب مغرب" میں عورت کے عورت پن کے ساتھ جو حشر کیا جاتا ہے ــــ اس پر ہمارا دل کبھی نہیں پسیجا"۔

آپ ان اقتباسات کو غور سے ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ کس قدر "سادگی" سے نتائج کو اسباب سمجھ کر حالات کا غلط تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ یورپ میں جنس کو جو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ درحقیقت صنفی انارکی کی علت نہیں بلکہ یہ براہِ راست نتیجہ ہے اُس حیوانی فلسفے کا جس پر مغربی تمدن کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے۔

مادی تہذیب کے علمبرداروں نے سب سے پہلے صنفِ نازک کے دل میں یہ شیطانی وسوسہ

پیدا کیا کہ اُس نے اپنے دائرۂ کار کو جو گھر کی چار دیواری کے اندر سمیٹ رکھا ہے، وہ درحقیقت اُس کی توہین و تذلیل ہے اس لیے اُسے زندگی کے ہر میدان میں مرد کے مدمقابل آنا چاہیے تاکہ اُس کی شخصیت کے اندر پختگی پیدا ہو سکے۔ یہ وہ پہلا فریب تھا جو اس سادہ لوح مخلوق نے "دشمنِ انسانیت" کے ہاتھوں کھایا۔ وہ بالکل بے حجاب ہو کر مرد کی ہمسری کے دعوے کے ساتھ میدان میں نکل کھڑی ہوئی اور اس بیچاری نے محض اپنی حماقت سے ہر اُس بوجھ کو اپنے اوپر بخوشی لادنا شروع کیا جس کے لیے وہ فطری لحاظ سے کوئی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ اس اندوہناک صورتِ حال سے پریشان ہو کر اُس نے جب کبھی بھی اضطراب کا اظہار کیا تو اُسے یہ کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس طرزِ عمل سے اُس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے اور اس کے چھپے ہوئے جوہر کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ یہ محض عبوری دَور ہے اس کے گزر جانے کے بعد اُسے آزادی کی دولت نصیب ہو گی اور وہ سوسائٹی کے ان بندھنوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑنے میں کامیاب ہو جائے گی جنھوں نے اُسے مرد کا دست نگر بنا رکھا تھا۔

یہ "فریب خوردہ" جب آزادی کے لالچ میں مردوں کے دوش بدوش کارخانوں، دفتروں اور دکانوں پر کام کرنے پر آمادہ ہوئی تو پھر اس کی عفت اور عصمت پر منظم ڈاکہ ڈالنے کے مختلف فلسفے گھڑے گئے۔ اُسے یہ باور کرایا گیا کہ یہ شرم اور حیا، پاکیزگی اور پاکدامنی سب "مذہبی دیوانوں" کے بتائے ہوئے ڈھکوسلے ہیں جن کا مقصد اُس کی آزادی کو سلب کرنا ہے۔ انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا ہے اس لیے اپنی صنفی خواہشات کی تکمیل میں بھی کسی قسم کی کوئی پابندی قبول نہ کرنی چاہیے۔ ابلیس کا یہ داؤ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس پر چل گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنا تن، من، دھن، الغرض اپنی زندگی کا قیمتی سے قیمتی سرمایہ سوسائٹی کی بھینٹ چڑھا دیا تاکہ اس کے دامن پر رجعت پسندی کا کوئی داغ نظر نہ آنے پائے۔ مرد نے اُس کی اس بے بسی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک طرف تو اس نے اپنی ذمہ داریوں کا بیشتر حصہ اُس کے ناتواں کندھوں پر ڈال

دیا، اور دوسری طرف اُس کی عزت و آبرو پر بڑی بے دردی کے ساتھ ہاتھ صاف کیے چنانچہ کچھ مدت گزر جانے کے بعد اب وہ زندگی کی اُس پست سطح پر آچکی ہے جس میں اُس کی زندگی کا مقصد صرف ایک ہی رہ گیا ہے کہ وہ کسی طرح مرد کی ہوس رانیوں کی بہتر سے بہتر طور پر تسکین کر سکے۔

آج کیلر اور اُسی طرح کی دوسری عورتیں جس قسم کی حماقتیں کر رہی ہیں۔ اُن میں حیرت کا کوئی پہلو نہیں وہاں کے مفکرین نے اپنے نظامِ حیات میں ذلت کا جو منصب انہیں سونپا ہے وہ بڑے جوش اور خوشدلی کے ساتھ اُس سے عہدہ برا ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں اور انہیں اس امر کا احساس تک نہیں کہ شیطان کی ذریت اُن کے ساتھ کوئی شرمناک کھیل کھیلنے میں مصروف ہے۔

ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء کے اشارات میں ایک مقام پر یہ عبارت شائع ہوئی تھی کہ "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کو نہ ماننے والا شخص چاہے خدا اور آخرت کو مانتا ہو، پھر بھی وہ یقیناً کافر ہے اور اس کا خدا و آخرت کو ماننا کسی طرح بھی نجات کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس معاملے میں سورۂ بقرۃ کی آیت اِنَّ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ . . . سے جو استدلال اس سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد کر چکے ہیں اور اب خلیفہ عبدالحکیم صاحب کر رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔"[1] حال ہی میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام ایک صاحب نے کراچی سے شکایت بھیجی ہے، جس میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد کی جانب اس خیال کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ ان صاحب نے مولانا مرحوم کے متعدد مطبوعہ مکاتیب اور تحریروں کا حوالہ دیا ہے اور ان میں سے بعض کی نقول بھی ارسال کی ہیں، جن سے مولانا آزاد کے اصل مدعا و منشاء کی وضاحت مقصود ہے صاحب مراسلہ کا مطالبہ ہے کہ بعض ضروری اقتباسات کو ترجمان میں چھاپ دیا جائے۔ ہمارے لیے اس پورے مواد کا نقل کرنا تو مشکل ہے تاہم یہاں ایک مکتوب کے چند اجزاء شائع کیے جا رہے ہیں تاکہ مرحوم کے معاملے میں کوئی غلط فہمی یا نا انصافی نہ ہونے پائے۔ یہ خط مولانا محی الدین صاحب قصوری کے نام تھا اور "تبرکاتِ آزاد"

---

[1] واضح رہے کہ مذکورۂ بالا اشارات مولانا مودودی کے قلم سے نہیں تھے

ترجمہ مولانا غلام رسول مہر بدین طبع ہو چکا ہے - اس میں اسی آیت کی تفسیر بیان ہوتی ہے جس کا حوالہ اشارات میں تھا:

"جن یہود و نصاریٰ و صابئہ کا اس آیت میں ذکر ہے ان سے مراد وہ یہود و نصاریٰ نہیں ہیں جو بعد بعثت آنحضرتؐ کے عہد میں تھے یا جو بعد ظہور اسلام کے دنیا میں رہیں گے - بلکہ صرف اُن کا جو ظہور اسلام سے پیشتر تھے - مگر اپنی قوم کی ضلالت تحریف و ترکِ شریعت و کتاب اللہ محفوظ رہے اور سچی یہودیت اور حقیقی عیسائیت پر کہ دراصل اسلام ہے (کیونکہ دین ایک ہے اور ہمیشہ سے ہے) ان کا خاتمہ ہوا - دراصل ایسے یہودی اور نصرانی آنحضرتؐ کے ظہور تک موجود تھے - یعقوبیہ عیسائیوں کا ایک بہت بڑا موحد فرقہ تھا جو مسیح کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا اور نہ کفارہ کا قائل تھا - روم کی کونسل روحانی نے اس کے داعی کو سزا دی - وہ بھاگ کر اسکندریہ آیا - سو اصل آج کل کے یونی ٹیرین عیسائی انہی کے بقایا ہیں مشہور بشپ یوحنا جو حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہاتھ پر بعد فتح مصر اسلام لایا اور سب سے پہلا حکیم اسلام قرار دیا گیا اسی فرقہ کا پادری تھا - یہ لوگ سچے عیسائی یعنی مسلمان تھے - مسیح کو نبی مانتے تھے - کفارہ کے قائل نہ تھے - نجات کا دارومدار اعمالِ صالحہ کو سمجھتے تھے - راتوں کو عبادتیں کرتے اور دن کو بیماروں کی خدمتیں - ان میں سے اکثر اربابِ بصیرت ایسے تھے کہ سچے دل سے فارقلیط کے موعودہ ظہور کے منتظر تھے - اور ان میں سے جن لوگوں نے اس پاک ظہور کو پایا سچے دل سے ایمان لائے - یہی لوگ تھے جن کی نسبت فرمایا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ - یہی دعوتِ اسلامی کو سُن کر جھک جاتے ہیں اور انکار نہیں کرتے - چنانچہ اس کے بعد فرمایا وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ - جب قرآن کو سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے جو آنسو بہنے لگتے ہیں اس لیے کہ اس کی سچائی کو انہوں نے پا لیا ہے - يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ - پس وہ پکار اٹھتے ہیں کہ خدایا ہم اس کلام پر ایمان لائے پس ہم کو شہدائے حق میں سے شمار کر -

ورقہ بن نوفل ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے طلبِ حق میں بڑا سفر کیا اور ایسے پادریوں سے ملے جو سرِ حقیقت سے واقف تھے۔ انہوں نے وصیت کی کہ فارقلیط کا ظہور قریب ہے ملنا تو ایمان لانا اور ہمارا اسلام کہنا۔ سلمانؓ نے جب واقعہ بیان کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متامل ہوئے کہ ایسے لوگوں کی نسبت کیا کہیں۔ اس پر یہ آیت اتری اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصَارٰی الخ یعنی وہ سچے انصاری تھے، سچے عیسائی تھے ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔

ابن ابی حاتم نے بسند متصل مجاہد سے یہ روایت بیان کی ہے اور متعدد طرق سے منقول ہے اور سعید بن جبیر نے بھی روایت کی ہے۔ قرآن ہر جگہ اہلِ کتاب سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کتاب اللہ کو قائم کرو جس کو تم نے نَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کر دیا ہے لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ۔ سورۂ مائدہ میں کہا وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ الخ پس اصل دین اللہ ایک ہے جو یہودی و عیسائی تورات و انجیل پر قائم رہے کیوں نہ ان کے لیے مغفرت و نجات ہو۔ بات بالکل صاف ہے اور خواہ مخواہ دوسری طرف جانا غلطی ہے یہی تفسیر خود آنحضرت نے کی، وہی تفسیر اصحابہ صحابہ و تابعینؓ مروی حضرت ابن عباسؓ سے بطریق متعددہ مروی ہے کہ مقصود امم سابقہ قبل از ظہور اسلام ہیں نیز ربطِ آیات کا بھی مقتضی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ امم سابقہ کے ساتھ آمنوا کیوں کہا؟ یعنی مومنین کا کیوں ذکر کیا؟ تو اس کا جواب خود ابن عباسؓ دے چکے ہیں چونکہ دین الٰہی ایک اور نتائج ایک اس لیے فرمایا کہ اصل کار ایمان باللہ و عملِ صالح ہے پس جو ایمان لائے اور جو سچے یہودی و نصرانی تھے سب اللہ کے نزدیک ایک درجے میں ہیں اور مغفرت کا دروازہ باز۔ باقی رہے ان اقوام کے وہ لوگ جنہوں نے آنحضرت کا زمانہ پایا اور تبلیغ و دعوت کی گئی اور انکار کر دیا یا اس کے بعد کرتے رہے تو ان کی نسبت یہی قرآن سورۂ حج میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصَّابِئِیْنَ وَالنَّصَارٰی وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ....۔

دنیائے اسلام کی موجودہ حالت

اور

اس میں اسلامی تحریکات کے لیے طریقِ کار

[یہ ایک تقریر ہے جو ۱۶ ذی الحج ۱۳۸۱ھ کو مکۂ معظمہ کی مسجد دہلوی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عربی زبان میں کی تھی۔ اس جلسہ میں خصوصیت کے ساتھ عرب ممالک کے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوئی تھی —— خ۔ ح]

خوش قسمتی سے آج مجھے یہ موقع مل رہا ہے کہ مرکزِ اسلام میں حج کے عالمگیر اجتماع کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے جو بندگانِ حق آئے ہوئے ہیں ان سے خطاب کروں اور ان کو یہ بتاؤں کہ اس زمانے میں مومنین صادقین اور خصوصاً ان کے نوجوان تعلیم یافتہ لوگوں کے کرنے کا اصل کام کیا ہے۔ میں اس قیمتی اور نادر موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید دوبارہ ایسا موقع مجھے پھر نہ مل سکے گا، اپنا دل کھول کر آپ کے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں تاکہ آپ لوگ اس وقت کی حقیقی صورتِ حال کو اور اس کے واقعی اسباب کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیں اور اس کی اصلاح کے لیے حکمت اور جرأت کے ساتھ وہ تدابیر اختیار کریں جو میرے نزدیک موزوں ترین تدابیر ہیں فلیبلغ الشاھد الغائب

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ دنیائے اسلام اس وقت دو بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک حصہ وہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور سیاسی اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا حصہ وہ جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور سیاسی اقتدار بھی انہی کے ہاتھ میں ہے۔ ان دونوں

حصوں میں سے فطری طور پر زیادہ اہمیت دوسرے حصے کو حاصل ہے اور ملت اسلامیہ کا مستقبل بہت بڑی حد تک اُس روش پر منحصر ہے جو آزاد مسلم مملکتیں اختیار کر رہی ہیں اور آگے اختیار کرنے والی ہیں۔ اگرچہ پہلا حصہ بھی کچھ کم وزن نہیں رکھتا۔ اپنی جگہ اس کو بھی بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ کیونکہ کسی نظریۂ حیات اور عقیدہ و مسلک کے پیرووں کا دنیا کے ہر خطے اور ہر گوشے میں پہلے ہی سے موجود ہونا، اور قلیل تعداد میں نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں موجود ہونا، اُن لوگوں کے لیے بڑی تقویت کا موجب ہو سکتا ہے جو اُس نظریے اور عقیدہ و مسلک کی علمبرداری کے لیے اٹھیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ نظریہ اور عقیدہ و مسلک خود اپنے ہی گھر میں مغلوب ہو جائے تو روئے زمین پر پھیلے ہوئے اُس کے یہ پیرو، جو پہلے ہی سے مغلوب ہیں، زیادہ دیر تک اپنے مقام پر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اس وقت نظریاً ہر دنیائے اسلام کے مستقبل کا انحصار اُن مسلم ممالک ہی کے مستقبل پر ہے جو انڈونیشیا اور ملایا سے لے کر مراکو اور نائیجیریا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا کوئی اور کرشمہ دکھا دے جس کا ہم ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ نہ کر سکتے ہوں وہ چاہے تو چٹانوں میں سے چشمے چھوڑ کر نکال سکتا ہے اور ریگستانوں کو اپنے ایک اشارے سے گلستانوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔

اب اسی مفروضے پر کہ دنیائے اسلام کا مستقبل مسلم ممالک کے ساتھ وابستہ ہے، ذرا اس امر کا جائزہ لیجیے کہ یہ ملک اس وقت کس حالت میں ہیں، اور جس حال میں یہ ہیں، اس کے اسباب کیا ہیں۔

آپ لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ ایک طویل مدت تک ذہنی جمود، عقلی انحطاط، اخلاقی زوال اور مادی اضمحلال میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار اکثر و بیشتر مسلمان ملک مغربی استعمار کے شکار ہوتے چلے گئے تھے۔ اٹھارویں صدی مسیحی سے یہ عمل شروع ہوا تھا اور موجودہ صدی کے اوائل میں یہ اپنے انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا۔ اس زمانے میں گنتی کے صرف دو چار مسلمان ملک باقی

رہ گئے تھے بہ براہِ راست مغربی مستعمرین کی سیاسی غلامی میں مبتلا ہونے سے بچ گئے۔ پے در پے شکستیں کھا کھا کر اُن کا حال غلام ملکوں سے بھی بدتر ہو گیا اور ان کی مرعوبیت اور دہشت زدگی اُن لوگوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھ گئی جو اپنی سیاسی آزادی پوری طرح کھو بیٹھے تھے۔

مغربی استعمار کے اس غلبے کا سب سے زیادہ تباہ کن نتیجہ وہ تھا جو ہماری ذہنی شکست اور ہمارے اخلاقی بگاڑ کی شکل میں رونما ہوا۔ اگر یہ مستعمرین ہمیں لوٹ کر بالکل غارت کر دیتے اور قتل عام کر کے ہماری نسلوں کو مٹا دیتے تب بھی یہ اتنا بڑا ظلم نہ ہوتا جتنا بڑا ظلم انہوں نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے اخلاقی مقاصد پھیلا کر ہم پر ڈھایا۔ جن جن مسلمان ملکوں پر اُن کا تسلط ہوا وہاں ان سب کی مشترک پالیسی یہ رہی کہ ہمارے آزاد نظام تعلیم کو ختم کر دیں، یا اگر وہ پوری طرح ختم نہ ہو سکے تو اس سے فارغ ہو کر نکلنے والوں کے لیے حیات اجتماعی میں کوئی مصرف باقی نہ رہنے دیں۔ اسی طرح یہ بھی ان کی پالیسی کا ایک لازمی جز رہا کہ مفتوح قوموں کی اپنی زبانوں کو ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان کی حیثیت سے باقی نہ رہنے دیں اور ان کی جگہ فاتحین کی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بھی بنائیں اور سرکاری زبان بھی قرار دے دیں۔ مشرق سے مغرب تک تمام مغربی فاتحین نے بالاتفاق یہی عمل تمام مسلم ممالک میں کیا، خواہ وہ ڈچ ہوں یا انگریز یا فرانسیسی یا اطالوی یا کوئی اور۔ اس طریقہ سے ان مستعمرین نے ہمارے ہاں ایک ایسی نسل تیار کر دی جو ایک طرف تو اسلام اور اس کی تعلیمات سے ناواقف، اس کے عقیدہ و مسلک سے بیگانہ، اور اس کی تاریخ اور روایات سے نابلد تھی، اور دوسری طرف اس کا ذہن اور اندازِ فکر اور زاویہ نظر مغربی سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ پھر اس نسل کے بعد پے در پے دوسری نسلیں ایسی اٹھتی چلی گئیں جو اسلام سے اور زیادہ دور اور مغربی فلسفہ حیات اور تہذیب و تمدن میں زیادہ سے زیادہ غرق ہو چکی تھیں۔ ان کے لیے اپنی زبان میں بات کرنا موجب ننگ و عار اور فاتحین کی زبان میں بولنا موجب افتخار بن گیا۔ مغربی فاتح نصرانیت کے لیے خواہ کتنے ہی متعصب ہوں، ان فرنگیت مآب غلاموں کو مسلمان ہونے پر شرم آنے لگی اور اسلام کے خلاف بغاوت کا یہ تجربہ اظہار کرنے لگے۔ مغربی فاتح اپنی فرسودہ اور بوسیدہ قومی

روایات کا کتنا ہی احترام کرتے ہوں، یہ غلام لوگ اپنی روایات کی تحقیر کرنا ہی اپنے لیے ذریعۂ عزت سمجھنے لگے۔ مغربی فاتحین نے مدت العمر مسلمان ملکوں میں رہنے کے باوجود کبھی مسلمانوں کے لباس اور طرزِ زندگی اختیار نہ کیے، مگر یہ غلام لوگ اپنے ہی ملکوں میں رہتے ہوئے ان فاتحین کے لباس، اُن کے رہن سہن کے طریقے، اُن کے کھانے پینے کے ڈھنگ، ان کی ثقافت کے اطوار حتیٰ کہ ان کی حرکات و سکنات تک کی نقل اتارنے لگے اور اپنی قوم کی ہر چیز ان کی نگاہوں میں حقیر ہو کر رہ گئی۔ پھر مغربی فاتحین کی تقلید میں ان لوگوں نے مادہ پرستی، الحاد، عصبیتِ جاہلیہ، قوم پرستی، اخلاقی بے قیدی اور فسق و فجور کا پورا زہر اپنے اندر جذب کر لیا، اور ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ جو کچھ مغرب کی طرف سے آتا ہے وہ سراسر حق ہے، اسے اختیار کرنا ہی ترقی پسندی ہے اور اس سے منہ موڑنے کے معنی رجعت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔

مغربی مستعمرین کی مستقل پالیسی یہ تھی کہ جو لوگ اس رنگ میں جتنے زیادہ رنگ جائیں اور اسلام کے اثرات سے جس قدر زیادہ عاری ہوں، اُن کو زندگی کے ہر شعبے میں اتنا ہی زیادہ بلند مرتبہ دیا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ سلطنتوں میں اونچے سے اونچے عہدے انہی کو ملے۔ مستعمرین کی فوجی اور سول ملازمتوں میں یہی کلیدی مناصب پر پہنچے۔ سیاست میں انہی کو اہم حیثیت حاصل ہوئی۔ سیاسی تحریکوں کے یہی لیڈر رہے۔ پارلیمنٹوں میں یہی نمائندے بن کر پہنچے اور مسلمان ملکوں کی معاشی زندگی پر بھی یہی چھا گئے۔

اس کے بعد جب مسلمان ملکوں میں آزادی کی تحریکیں اٹھنی شروع ہوئیں تو ناگزیر تھا کہ ان تحریکوں کی قیادت یہی لوگ کریں، کیونکہ یہی حکمرانوں کی زبان میں بات کر سکتے تھے، یہی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے، اور یہی اُن سے قریب تر تھے۔ اسی طرح جب یہ ممالک آزاد ہونے شروع ہوئے تو آزادی کے بعد اقتدار بھی انہی کے ہاتھوں میں منتقل ہوا اور مستعمرین کی خلافت انہی کو نصیب ہوئی، کیونکہ مستعمرین کے ماتحت سیاسی نفوذ و اثر انہی کو حاصل تھا، سول حکومت کا نظم و نسق یہی چلا رہے تھے اور فوجوں میں بھی قیادت کے مناصب پر یہی فائز تھے۔

استعمار کے آغاز سے لے کر اس کے اختتام اور آزادی کی ابتدا تک کی اس تاریخ کے چند نمایاں پہلو ایسے ہیں جنہیں نگاہ میں رکھنا ضروری ہے، کیونکہ انہیں نظر انداز کر کے اِس وقت کی پوری صورتِ حال کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھا جا سکتا۔

اوّل یہ کہ مغربی مستعمرین اپنی پوری مدتِ استعمار میں کسی جگہ بھی اس بات پر قادر نہیں ہو سکے کہ عام مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکیں۔ انہوں نے جہالت ضرور پھیلائی اور عوام کے اخلاق بھی بہت کچھ بگاڑے، اور اسلامی قوانین کی جگہ اپنے قوانین رائج کر کے مسلمانوں کو غیر مسلمانہ زندگی بسر کرنے کا خوگر بھی بنا دیا، لیکن اس کے باوجود دنیا کی کوئی مسلمان قوم بھی من حیث القوم ان کے زیرِ اثر رہ کر اسلام سے باغی نہ ہو سکی۔ آج دنیا کے ہر ملک میں عام لوگ اسلام کے ویسے ہی معتقد ہیں جیسے تھے۔ وہ چاہے اسلام کو جانتے نہ ہوں مگر اسے مانتے ہیں اور اس کے ساتھ گہرا عشق رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور چیز پر راضی نہیں ہیں۔ اُن کے اخلاق بُری طرح بگڑ چکے ہیں اور ان کی عادتیں بہت خراب ہو چکی ہیں، لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں اور ان کے معیار جوں کے توں قائم ہیں۔ وہ سود اور زنا اور شراب نوشی میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں، مگر چھوٹی سی فرنگیت زدہ اقلیت کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں آپ کو ایسا کوئی شخص نہ ملے گا جو ان چیزوں کو حرام نہ مانتا ہو۔ وہ رقص و سرود اور دوسرے فواحش کی لذتوں کو چاہے چھوڑ نہ سکتے ہوں مگر چھوٹی سی مغرب زدہ اقلیت کے سوا عامۃ المسلمین کسی طرح بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ یہی اصل ثقافت ہے۔ اسی طرح مغربی قوانین کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے ان کی پشتیں گزر چکی ہیں، مگر ان کے دماغ میں آج تک یہ بات نہیں اتر سکی ہے کہ یہی قوانین برحق ہیں اور اسلام کا قانون فرسودہ ہو چکا ہے۔ مغرب زدہ اقلیت ان مغربی قوانین پر چاہے کتنا ہی ایمان لا چکی ہو، عام مسلمان ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام ہی کے قانون کو برحق مانتی ہے اور اس کا نفاذ چاہتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ علمائے دین ہر جگہ عوام کے قریب ہیں، کیونکہ وہ انہی کی زبان سے بولتے ہیں اور اُسی عقیدہ و مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں جس کے عوام معتقد ہیں۔ لیکن زمامِ اقتدار سے وہ

کلی طور پر بے دخل ہیں، اور ایک مدت دراز تک دینوی معاملات سے بے تعلق رہنے کے باعث اُن میں یہ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کر سکیں اور زمام اقتدار ہاتھ میں لے کر کسی ملک کا انتظام چلا سکیں۔ اسی وجہ سے کسی مسلمان ملک میں بھی وہ آزادی کی تحریک کے قائد نہ بن سکے اور کہیں بھی آزادی کے بعد اقتدار میں وہ شریک نہ ہو سکے۔ ہماری اجتماعی زندگی میں ایک مدت سے اُن کا کام بس وہ ہے جو ایک موٹر میں بریک کا ہوتا ہے۔ ڈرائیور مغربیت زدہ طبقہ ہے اور یہ بریک گاڑی کی رفتار کو تیز ہونے سے کچھ نہ کچھ روک رہا ہے۔ مگر بعض ملکوں میں بریک ٹوٹ چکا ہے اور گاڑی پوری سرعت کے ساتھ نشیب کی طرف جا رہی ہے، اگرچہ اس کے چلانے والے اس غلط فہمی میں ہیں کہ وہ فراز پر چڑھ رہے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی، اس کے قائدین اگرچہ وہی مغربیت زدہ لوگ تھے، لیکن کسی جگہ بھی وہ عام مسلمانوں کو مذہبی اپیل کے بغیر نہ حرکت میں لا سکے اور نہ قربانیاں دینے پر آمادہ کر سکے۔ بلا استثناء ہر جگہ انہیں اسلام کے نام پر لوگوں کو پکارنا پڑا۔ ہر جگہ اُن کو خدا اور رسول اور قرآن ہی کے نام پر اپیل کرنی پڑی۔ ہر جگہ انہیں آزادی کی تحریک کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دینا پڑا۔ اس کے بغیر وہ کہیں بھی اپنی قوم کو اپنے پیچھے نہ لگا سکتے تھے۔ اب یہ تاریخ عالم کی عظیم ترین غداریوں میں سے ایک بے نظیر غداری ہے کہ ہر جگہ آزادی حاصل کرنے کے بعد فوراً ہی یہ لوگ اپنے تمام وعدوں سے پھر گئے اور ان کا پہلا شکار وہی اسلام ہوا جس کے نام پر انہوں نے آزادی کا معرکہ جیتا تھا۔

چوتھی اور آخری بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان لوگوں کی قیادت میں مسلمان ملکوں کو جو آزادی حاصل ہوئی ہے وہ صرف سیاسی آزادی ہے۔ پچھلی غلامی اور اس آزادی میں فرق صرف یہ ہے کہ پہلے جو زمام اقتدار باہر والوں کے ہاتھ میں تھی، اب وہ گھر والوں کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے کہ جس ذہن کے آدمی جن نظریات اور اصولوں کے ساتھ پہلے حکومت کر رہے تھے اُسی ذہن کے آدمی انہی نظریات کے ساتھ آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ وہی نظام تعلیم جو مستعمرین

نے قائم کیا تھا اب بھی چل رہا ہے۔ انہی کے رائج کردہ قوانین نافذ ہیں اور آگے مزید قانون سازی انہی خطوط پر ہو رہی ہے۔ بلکہ مغربی مستعمرین نے مسلمانوں کے قانون احوال شخصیہ (پرسنل لا) پر جو دست درازیاں کرنے کی کبھی ہمت نہ کی تھی وہ آج آزاد مسلم مملکتوں میں کی جا رہی ہے۔ تہذیب و ثقافت اور اخلاق و تمدن کے جو نظریات مستعمرین دے گئے ہیں، ان میں سے کسی چیز کو بدلنا تو درکنار، آج یہ لوگ اپنی قوموں کو ان سے بھی زیادہ اُس تہذیب میں غرق اور ان اخلاقی نظریات کے مطابق مسخ کر رہے ہیں۔ وہ قومیت کے مغربی نظریات کے سوا اجتماعی زندگی کا کوئی دوسرا نقشہ نہیں سوچ سکتے۔ اسی نقشے پر وہ مسلم مملکتوں کے نظام چلا رہے ہیں اور اس کی وجہ سے انہوں نے مسلمان قوموں کو ایک دوسرے سے پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان کے ذہنوں میں الحاد بس گیا ہے اور جہاں جہاں بھی انہیں اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے وہاں وہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اس حد تک خراب کرتے چلے جا رہے ہیں کہ وہ خدا اور رسول اور آخرت کا مذاق اڑاتی ہیں۔ وہ اباحیت میں خود مستغرق ہیں اور ان کی قیادت، ہر جگہ مسلمانوں کے اندر فسق و فجور اور بے حیائی پھیلاتی چلی جا رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مغربی استعمار کے چاہے کتنے ہی دشمن ہوں، مغربی مستعمرین اُن کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ ان کی ہر ادا پر یہ مرے مٹتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو یہ معیار حق سمجھتے ہیں۔ ان کے ہر کام کی یہ نقل اتارتے ہیں۔ اُن میں اور ان میں فرق صرف یہ ہے کہ وہ مجتہد ہیں اور یہ محض اندھے مقلد۔ یہ اُن کی پٹی ہوئی راہوں سے ہٹ کر ایک انچ بھی کوئی نیا راستہ نہیں نکال سکتے۔

یہ چار حقائق جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیے ہیں، ان کو نگاہ میں رکھ کر آپ دنیا کی آزاد مسلمان قوموں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیں تو اس وقت کی پوری صورت حال آپ پر واضح ہو جائے گی۔ دنیا کی تمام آزاد مسلم حکومتیں اس وقت بالکل کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ کیونکہ ہر جگہ وہ اپنی اپنی قوموں کے ضمیر سے لڑ رہی ہیں۔ ان کی قومیں اسلام کی طرف پلٹنا چاہتی ہیں اور یہ اُن کو زبردستی مغربیت کی راہ پر گھسیٹ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کہیں بھی مسلمان قوموں کے دل اپنی حکومتوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ حکومتیں اس وقت مضبوط ہوتی ہیں جب حکمرانوں کے ہاتھ اور

قوموں کے دل پوری طرح متفق ہو کر تعمیر حیات کے لیے سعی کریں۔ اس کے بجائے جہاں دل اور ہاتھ ایک دوسرے سے نزاع و کشمکش میں مشغول ہوں وہاں ساری قوتیں آپس ہی کی لڑائی میں کھپ جاتی ہیں اور تعمیر و ترقی کی راہ میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوتی۔

اسی صورتِ حال کا ایک فطری نتیجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان ملکوں میں پے درپے آمریتیں قائم ہو رہی ہیں۔ مغربیت زدہ طبقے کی وہ چھوٹی سی اقلیت، جس کو مستعمرین کی خلافت حاصل ہوئی ہے، اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر نظامِ حکومت عوام کے ووٹوں پر مبنی ہو تو اقتدار اُن کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتا بلکہ جلدی یا دیر سے وہ لازماً ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جائے گا جو عوام کے جذبات اور اعتقادات کے مطابق حکومت کا نظام چلانے والے ہوں۔ اس لیے وہ کسی جگہ بھی جمہوریت کو چلنے نہیں دے رہے ہیں اور آمرانہ نظام قائم کرتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ فریب دینے کے لیے انہوں نے آمریت کا نام جمہوریت رکھ دیا ہے۔

ابتداءً کچھ مدت تک قیادت اس گروہ کے سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں رہی اور سول حکام مسلمان ملکوں کے نظم و نسق چلاتے رہے۔ لیکن یہ بھی اسی صورت حال کا ایک فطری نتیجہ تھا کہ مسلمان ملکوں کی فوجوں میں بہت جلدی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ آمریت کا اصل انحصار انہی کی طاقت پر ہے۔ یہ احساس بہت جلدی فوجی افسروں کو میدان سیاست میں لے آیا اور انہوں نے خفیہ سازشوں کے ذریعے سے حکومتوں کے تختے الٹنے اور خود اپنی آمریتیں قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اب مسلمان ملکوں کے لیے ان کی فوجیں ایک مصیبت بن چکی ہیں۔ اُن کا کام باہر کے دشمنوں سے لڑنا اور ملک کی حفاظت کرنا نہیں رہا بلکہ اب اُن کا کام یہ ہے کہ اپنے ہی ملکوں کو فتح کریں اور جو ہتھیار اُن کی قوموں نے ان کو مدافعت کے لیے دیے تھے انہی سے کام لے کر وہ اپنی قوموں کو اپنا غلام بنا لیں۔ اب مسلمان ملکوں کی قسمتوں کے فیصلے انتخابات یا پارلیمنٹوں میں نہیں بلکہ فوجی بیرکوں میں ہو رہے ہیں۔ اور یہ فوجیں بھی کسی ایک قیادت پر متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ہر فوجی افسر اس تاک میں لگا ہوا ہے کہ کب اسے کوئی سازش کرنے کا موقع ملے اور وہ دوسرے کو مار کر خود اس کی

جگہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک جب آتا ہے تو زعیم انقلاب بن کر آتا ہے اور جب رخصت ہوتا ہے تو خائن و غدار قرار پاتا ہے۔ مشرق سے مغرب تک بیشتر مسلمان قومیں اب محض تماشائی ہیں۔ ان کے معاملات کے چلانے میں اب ان کی رائے اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ان کے علم کے بغیر اندھیرے میں انقلاب کی کھچڑی پکتی ہے اور کسی روز یکایک ان کے سروں پر الٹ دی جاتی ہے۔ البتہ ایک چیز میں یہ سب متحارب انقلابی لیڈر متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان میں سے جو بھی ابھر کر اوپر آتا ہے وہ اپنے پیش رو ہی کی طرح مغرب کا ذہنی غلام اور الحاد و فسق کا علمبردار ہوتا ہے۔

ان تاریک حالات میں ایک روشنی موجود ہے جس کے اندر دو حقیقتیں مجھے صاف نظر آرہی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے الحاد و فسق کے ان علمبرداروں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا ہے اور یہ خود ہی ایک دوسرے کی جڑ کاٹ رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ متحد ہوتے تو ناقابل علاج مصیبت بن جاتے۔ مگر ان کا رہنما شیطان ہے اور شیطان کا کید ہمیشہ ضعیف ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری اہم حقیقت جو میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ مسلمان قوموں کے دل بالکل محفوظ ہیں، وہ ہرگز ان نام نہاد انقلابی لیڈروں سے راضی نہیں ہیں اور اس امر کے پورے امکانات موجود ہیں کہ اگر کوئی صالح گروہ فکر کے اعتبار سے مسلمان، اور ذہنی قابلیتوں کے لحاظ سے قیادت کا اہل ہو تو آخر کار وہی غالب آئے گا اور مسلمان قومیں اس الحاد و فسق کی قیادت سے نجات پا جائیں گی۔

اس وقت کام کا اصل موقع اُن لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے ایک طرف مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے اور دوسری طرف جن کے دلوں میں خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان محفوظ ہے۔ قدیم طرز کی دینی تعلیم پائے ہوئے لوگ، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اور علم دین کے لحاظ سے ان کے بہترین مددگار بن سکتے ہیں، مگر بدقسمتی سے وہ اُن صلاحیتوں کے حامل نہیں ہیں جو قیادت اور زمام کار سنبھالنے کے لیے درکار ہیں۔ یہ صلاحیتیں فی الحال صرف مقدم الذکر گروہ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ اس وقت یہی گروہ آگے بڑھ کر کام کرے۔ ان لوگوں کو جو مشورہ میں دے سکتا ہوں وہ مختصراً یہ ہیں:-

اولاً، ان کو اسلام کا صحیح علم حاصل کرنا چاہیے تاکہ ان کے دل جس طرح مسلمان ہیں اسی طرح ان کے دماغ بھی مسلمان ہو جائیں اور یہ اجتماعی معاملات کو اسلامی احکام اور اصولوں کے مطابق چلانے کے قابل بن جائیں۔

ثانیاً، ان کو اپنی اخلاقی اصلاح کرنی چاہیے تاکہ ان کی زندگیاں عملاً بھی اُسی اسلام کے مطابق ہو جائیں جس کو وہ اعتقاداً برحق مانتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قول اور عمل کا تضاد آدمی کے اندر نفاق پیدا کرتا ہے اور باہر کی دنیا میں اس کا اعتماد ختم کر دیتا ہے۔ آپ کی کامیابی کا سارا انحصار اخلاص اور راستبازی پر ہے، اور کوئی ایسا شخص نہ مخلص ہو سکتا ہے، نہ مخلص مانا جا سکتا ہے جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ آپ کی اپنی زندگی میں اگر تناقض ہوگا تو نہ دوسرے آپ پر اعتماد کریں گے اور نہ خود آپ کے دل میں اپنے اوپر وثوق پیدا ہو سکے گا۔ اس لیے دعوتِ اسلامی کے لیے کام کرنے والے تمام لوگوں کو میری مخلصانہ نصیحت یہ ہے کہ جن جن امور کے متعلق انہیں یہ علم حاصل ہو جائے کہ اسلام نے ان کا حکم دیا ہے اُن پر عامل ہونے کی اور جن کے متعلق انہیں معلوم ہو جائے کہ اسلام نے انہیں منع کیا ہے، ان سے اجتناب کرنے کی پوری کوشش کریں۔

ثالثاً، اُن کو اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں اور تحریر و تقریر کی قوتیں اس کام پر صرف کر دینی چاہئیں کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفۂ حیات پر تنقید کر کے اُس بُت کو پاش پاش کر دیں جس کی آج دنیا میں پرستش کی جا رہی ہے اور اُس کے مقابلے میں اسلام کے عقائد اور اصول و مبادی اور قوانین حیات کی تشریح و تدوین ایسے معقول طریقوں سے کریں جو نسلِ جدید کے ذہن کو ان کی صحت کا یقین دلا سکے اور ان کے اندر یہ اعتماد پیدا کر سکے کہ دورِ حاضر میں ایک قوم ان عقائد اور اصول و قوانین کو اختیار کر کے نہ صرف ترقی کر سکتی ہے بلکہ دوسروں سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ یہ کام جتنے صحیح خطوط پر جتنے بڑے پیمانے پر ہوگا اتنے ہی دعوتِ اسلامی کے لئے آپ کو سپاہی ملتے چلے جائیں گے اور یہ سپاہی ہر شعبۂ حیات سے نکل نکل کر آئیں گے۔ اس عمل کا سلسلہ ایک طویل مدت تک جاری رہنا چاہیے، تاکہ ایک کثیر تعداد اُن لوگوں کی پیدا ہو جائے جو ایک ملک

کے نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانے کے لیے درکار ہیں۔ یہ عمل جب تک بتدریج اپنی انتہا کو نہ پہنچ جائے آپ کسی اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی توقع نہیں کر سکتے۔ اور اگر کسی مصنوعی طریقے سے وہ برپا ہو بھی جائے تو وہ مستحکم نہیں ہو سکتا۔

رابعاً دعوت اسلامی سے جتنے لوگ متاثر ہوتے جائیں ان کو منظم ہونا چاہیے اور ان کی تنظیم کو ڈھیلا اور سست نہ ہونا چاہیے۔ نظم و ضبط اور سمع و طاعت کے بغیر محض ہم خیال لوگوں کا ایک بکھرا ہوا گروہ فراہم کر دینے سے کوئی کارگر طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

خامساً اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کو عوام میں اپنی دعوت پھیلانی چاہیے تاکہ عام لوگوں کی جہالت دور ہو اور وہ اسلام سے واقف ہوں اور اسلام و جاہلیت کا فرق جان لیں۔ اس کے ساتھ انہیں عوام کی اخلاقی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیے اور فسق و فجور کے اس سیلاب کو روکنے کے لیے اپنا پورا زور لگا دینا چاہیے جو فاسق قیادت کے اثر سے مسلمان قوم میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک قوم فاسق ہو جانے کے بعد ایک اسلامی حکومت کی رعایا بننے کے قابل نہیں رہتی۔ عامۃ الناس میں فسق جتنا بڑھے گا اُن کے معاشرے میں اسلامی نظام کا چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ جھوٹے، بددیانت اور بدکار لوگ نظام کفر کے لیے جتنے موزوں ہیں، نظام اسلامی کے لیے اتنے ہی غیر موزوں ہیں۔

سادساً، انہیں بے صبر ہو کر خام بنیادوں پر جلدی سے کوئی اسلامی انقلاب برپا کر دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے اس کے لیے بڑا صبر درکار ہے۔ حکمت کے ساتھ جانچ تول کر ایک ایک قدم اٹھائیے اور دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے خوب اطمینان کر لیجیے کہ پہلے قدم میں جو نتائج آپ نے حاصل کیے ہیں وہ مستحکم ہو چکے ہیں۔ جلد بازی میں جتنی پیش قدمی بھی ہو گی اس میں فائدے کی بہ نسبت نقصان کا خطرہ زیادہ ہو گا۔ مثال کے طور پر فاسق قیادت کے ساتھ شریک ہو کر یہ امید کی جاتی ہے کہ شاید اس طرح منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ آسان ہو جائے گا اور کچھ نہ کچھ اپنے مقصد کے لیے مفید کام بھی ہو سکے گا۔ لیکن عملی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اس لالچ

سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کیونکہ دراصل زمام امر جن لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اپنی ہی پالیسی چلاتے ہیں اور ان کے ساتھ لگنے والوں کو ہر قدم پر ان سے مصالحتیں کرنی پڑتی ہیں، یہاں تک کہ وہ آخر کار بس ان کے آلۂ کار بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انہیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحہ کے ذریعہ سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک ہی کے ذریعہ سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے بڑے پیمانہ پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے۔ لوگوں کے خیالات بدلیے۔ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو مسخر کیجیے۔ اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا وہ ایسا پائیدار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کر سکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر مصنوعی طریقوں سے اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے تو جس راستے سے وہ آئے گا اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جا سکے گا۔

یہ چند کلمات نصیحت ہیں جو دعوت اسلامی کے لیے کام کرنے والوں کے سامنے میں پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کی رہنمائی فرمائے اور ہمیں دین حق کی سربلندی کے لیے صحیح طریقے سے جدوجہد کرنے کی توفیق بخشے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تجاویز درباب انتظاماتِ حج

[یہ وہ تجاویز ہیں جو رابطہ عالم اسلامی کی مجلس تاسیسی کے حالیہ اجلاس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی تھیں۔ ان تجاویز کو مجلس نے سعودی حکومت کی وزارت حج اور دوسرے متعلقہ اداروں کے غور وخوض کے لیے بھیج دیا ہے۔ خ ح]

(۱) حرم سے متصل جو سڑکیں واقع ہیں ان پر نمازوں کے اوقات میں ہارن بجانے کی ممانعت کر دی جائے۔

(۲) حرم میں عورتوں کے لیے مختلف اطراف میں جگہیں مخصوص کر دی جائیں اور اُن کے آنے جانے کے لیے دروازے بھی مخصوص کر دیے جائیں۔

(۳) حجرِاسود کے بوسے کے لیے رکن یمانی سے ملتزم تک کٹہرہ لگا دیا جائے جس کے اندر بیک وقت ایک آدمی سے زیادہ داخل نہ ہو سکے۔ رکن یمانی کی طرف سے لوگ داخل ہوں اور ملتزم کے پاس نکلیں۔ دونوں طرف پہرہ دار مقرر کر دیے جائیں جو باقاعدگی کے ساتھ لوگوں کو داخل کریں اور نکالیں۔ خروج کے راستے سے کسی کو داخل نہ ہونے دیا جائے اور بوسہ دینے والوں کو زیادہ دیر تک حجرِاسود کے ساتھ لپٹا نہ رہنے دیا جائے۔

(۴) مطاف کے گرد بھی کٹہرہ لگا دیا جائے اور ایک دروازہ داخلہ کے لیے اور ایک باہر نکلنے کے لیے رکھا جائے۔ ہر دس یا پندرہ منٹ کے بعد پانچ سو یا ایک ہزار جتنی بھی مطاف کی وسعت اجازت دے، آدمیوں کو طواف کے لیے داخل کیا جاتا رہے۔ ہر تین یا چار گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ عورتوں کے طواف کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

(۵) مقام ابراہیم کے متعلق تمام شرعی احکام کو نگاہ میں رکھتے ہوئے میری رائے یہ ہے کہ اس جگہ ایک بالائی منزل زمین سے ۱۲ فٹ بلند بنا دی جائے اور مقام ابراہیم پر جو پتھر رکھا ہوا ہے اسے

اوپر کی منزل میں ٹھیک اُسی جہت پر اور کعبہ سے اسی فاصلے پر جس پر وہ اب ہے نصب کر دیا جائے۔ نیز بالائی منزل ہی میں اتنی جگہ رکھ دی جائے کہ طواف سے فارغ ہونے والے لوگ بہ سہولت نماز پڑھ سکیں۔ نیچے کا حصہ مطاف میں شامل کر دیا جائے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر آئندہ مطاف کی مزید توسیع کرنی پڑے تو مقام ابراہیم کو ہٹانے کا سوال باربار نہ چھڑیگا۔

(۶) رمی جمار کے لیے جمرات کے قریب پانچ یا سات کٹہرے علی الترتیب بنا دیے جائیں اور پیچھے کا ہر کٹہرہ آگے والے کٹہرے سے کچھ اونچا رکھا جائے۔ ان میں داخل ہونے کے لیے ایک راستہ اور خارج ہونے کے لیے دوسرا رکھ دیا جائے۔ دونوں طرف سپاہی کھڑے کر دیے جائیں جو ایک طرف سے لوگوں کو داخل کریں اور خروج کے راستہ سے کسی کو داخل نہ ہونے دیں۔

(۷) منیٰ میں بڑی بڑی پختہ بیرکیں بنا دی جائیں جن میں لوگوں کے قیام کے لیے کافی جگہ ہو۔ نیز جو لوگ اہل و عیال کے ساتھ ٹھیرنے والے ہوں ان کے لیے ایسی جگہیں بیرکوں میں رکھ دی جائیں جہاں وہ پردے ڈال کر رہ سکیں۔ ہر بیرک کے ساتھ کافی غسل خانے اور بیت الخلاء بنا دیے جائیں۔ ان بیرکوں کی تعمیر کا خرچ حکومت سعودیہ پر نہ پڑنا چاہیے۔ مختلف مسلمان ملکوں کی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کی اوسط تعداد کے مطابق اپنے خرچ پر یہ بیرکیں بنوادیں اور انہیں وقف فی سبیل اللہ کر دیں۔ ان کی مرمت کا خرچ بھی انہی حکومتوں کے ذمہ رہے۔ اور ان کے سفارت خانے اپنے عملے کے ذریعہ سے ان کا انتظام سنبھال لیں۔ جن ممالک میں مسلمانوں کی بڑی آبادیاں ہیں

ا؎ واضح رہے کہ اس وقت مقام ابراہیم پر پہنچ کر طواف کرنے والوں کا ہجوم جگہ کی تنگی کے باعث اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات جانیں تک ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسی بنا پر یہ مسئلہ چھڑا ہوا ہے کہ مقام ابراہیم کو آیا اس کی جگہ سے ہٹایا جا سکتا ہے یا نہیں۔

۲؎ منیٰ میں جس مقام پر کنکریاں ماری جاتی ہیں وہاں بھی لوگوں کے شدید ازدحام کے باعث اکثر حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تجویز حادثات کی روک تھام کے لیے پیش کی گئی ہے۔

مگر حکومت غیر مسلم ہے وہاں کے لوگوں سے اگر اپیل کی جائے تو وہ اپنے چندوں سے اپنے لیے بیرکیں بنوالیں گے۔ قلیل آبادیوں والے ملکوں سے جو تھوڑے حاجی آتے ہیں ان کو بآسانی کہیں نہ کہیں جگہ دی جا سکتی ہے۔

ان بیرکوں میں ٹھیرنے کی کوئی فیس نہ ہونی چاہیے۔

معلمین کو صرف حاجیوں کے نقل و حمل کا انتظام کرنا چاہیے۔

ہر بیرک کے ساتھ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے پیپ رکھ دیے جائیں اور ان کو وقتاً فوقتاً صاف کیا جاتا رہے۔

(۸) زمزم کو اوپر سے پاٹ دیا جائے اور اس کی موجودہ جگہ مطاف میں شامل کر دی جائے۔ زمزم کا پانی مشین کے ذریعہ سے کھینچ کر ایک ٹنکی میں جمع کیا جاتا رہے اور حرم کے اندر ایک بڑے احاطے میں بکثرت نل لگا دیے جائیں جن سے ہر شخص پانی لے سکے۔ زمزم کا پانی تقسیم کرنے کی جو قیمت اب لی جاتی ہے یہ بہت ہی بدنما چیز ہے۔ اس کو بند کرنے سے متعلقہ لوگوں کو جو نقصان بھی ہو اس کی تلافی کے لیے حاجیوں سے رضاکارانہ چندے لیے جا سکتے ہیں۔ دولت مند حاجی اس غرض کے لیے اتنے چندے دے دیں گے کہ شاید ان لوگوں کی موجودہ آمدنی سے بھی زیادہ ہوں گے۔ لیکن یہ طریقہ بہر حال بند ہونا چاہیے کہ ایک شخص کو جب تک وہ روپیہ نہ دے زمزم کا پانی نہیں ملتا۔

(۹) معلمین اور ان کے زیارت کرانے والوں کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے جس میں ان کو نہ صرف حج کے شرعی مسائل اچھی طرح بتائے جائیں، بلکہ ساتھ ساتھ انہیں ایسی اخلاقی تربیت بھی دی جائے جس سے وہ اللہ کے مہمانوں کے ساتھ شایان شان برتاؤ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ بحالتِ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ حج حاجیوں کے لیے تو عبادت ہے مگر ان لوگوں کے لیے وہ صرف تجارت ہے۔ اور حاجیوں کے ساتھ ان کا سلوک ایسا ہے جس کا عام حاجیوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔

(۱۰) مختلف ملکوں کے حاجیوں کے لیے معلمین کے گروپ بنا دیے جائیں جن میں ہر ملک سے آنے والے

حاجیوں کی تعداد کے لحاظ سے پانچ پانچ سات سات، یا اس سے کچھ کم و بیش معلم شامل ہوں۔ ان معلمین کے عملے کو اس ملک کی زبان سکھائی جائے جس کے لیے وہ مخصوص کیے گئے ہوں۔

(۱۱) وزارتِ حج کے تحت چند افسر اس غرض کے لیے مقرر ہونے چاہئیں جو معلمین کے طریقوں کی نگرانی کریں اور کسی معلم کے طرزِ عمل سے اگر حاجیوں کو شکایت پیدا ہو تو اس کی اصلاح بروقت کر دیں۔

(۱۲) زمانۂ حج میں مختلف ملکوں سے آنے والے علماء کے لیے ایسے انتظامات کیے جائیں کہ وہ اپنے اپنے ملک کی زبانوں میں اپنے ملک کے حاجیوں کو نہ صرف وعظ و تلقین کریں، بلکہ حج کے متعلق ضروری شرعی مسائل بھی بتاتے جائیں۔

(۱۳) منیٰ میں مختلف مقامات پر آٹھ یا دس قربان گاہیں بنا دی جائیں اور لوگوں کو اپنے اپنے ٹھکانوں اور سڑکوں پر قربانی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ان قربان گاہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ میں جانور ذبح کیے جائیں اور دوسرے حصہ میں جانوروں کی خرید و فروخت ہو۔ آج کل منیٰ میں جو بدنظمی نظر آ رہی ہے اور جگہ جگہ قربانی کے جانور پڑے نظر آتے ہیں اُس کی وجہ یہ ہے کہ لاکھوں حاجیوں کے لیے صرف ایک ہی قربان گاہ ہے اور اس میں بھی جانور فروخت کرنے اور ان کو ذبح کرنے کی جگہیں الگ الگ نہیں ہیں۔

(۱۴) قربانی کا گوشت جس طرح سے ضائع ہو رہا ہے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس سے تشویش لاحق ہے اور اسلام کے مخالفین کو اس کی آڑ میں اسلامی روایات کی تضحیک کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس لیے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ منیٰ میں ہر قربان گاہ کے ساتھ ایک ایک کولڈ سٹوریج قائم کیا جائے۔ جانوروں کو ذبح کر کے ان کی کھال اتارنے کے باقاعدہ انتظامات کیے جائیں۔ تمام گوشت کولڈ سٹوریج میں محفوظ کر لیا جائے۔ ایامِ منیٰ میں ہر شخص کو حق ہو کہ جتنا گوشت چاہے کولڈ سٹوریج سے حاصل کرے۔ باقی جتنا گوشت بچ رہے اُسے ڈبوں میں بند کر کے فروخت کر دیا جائے۔ نیز کھالیں بھی فروخت کی جائیں اور ان سے جس قدر آمدنی ہو اسے غریب حجاج کی

مدد اور فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے[1] ۔ اس مقصد کے لیے ہم پاکستان سے ماہرین بھیجنے کے لیے تیار ہیں۔ پاکستان میں مجھ سے متعدد ماہرین نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ان کے مشورے سے ایسی اسکیم بنائی جا سکتی ہے جس سے قربانی کے جانوروں کے گوشت، کھال، خون، ہڈی اور آنتوں کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

---

[1] یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قربانی کے گوشت اور کھال کو فروخت کرنا اس شخص کے لیے ممنوع ہے جس نے قربانی کی ہو، اور اگر وہ فروخت کرے تو اسے لازم ہے کہ اس روپے کو صدقہ کر دے۔ لیکن اگر صورت حال یہ ہو کہ قربانی کرنے والے اپنا ذبح کیا ہوا جانور یونہی چھوڑ جاتے ہوں، یا اس میں سے کچھ گوشت لے کر باقی گوشت ویسے ہی چھوڑ دیتے ہوں اور اس کا اچھا خاصا حصہ ضائع ہو جاتا ہو، اور حکومت اس کو ضیاع سے بچانے کے لیے کوئی انتظام کرے، تو اس کو حق پہنچتا ہے کہ اس انتظام کے مصارف اسی گوشت اور کھالوں سے وصول کرے۔ ظاہر ہے کہ جب زکوٰۃ میں سے عاملین علیہا کے مصارف لینے کا حکومت کو حق ہے تو قربانیوں کے گوشت اور کھالوں سے وہ مصارف لینے کا اسے کیوں حق نہ ہو جو ان کو ضیاع سے بچانے کا انتظام کرنے میں اسے برداشت کرنے ہوں گے۔ ان مصارف سے زائد اگر کوئی آمدنی حاصل ہو تو اس سے غریب حجاج کی مدد مختلف طریقوں پر کی جا سکتی ہے۔

ایک ضروری تصحیح

"ترجمان" کے گزشتہ شمارے میں "تعدد ازواج" کے زیر عنوان رسائل و مسائل کے حصے میں شائع شدہ جواب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا تحریر کردہ تھا۔ افسوس ہے کہ فہرست مضامین میں غلطی سے اس عنوان کے سامنے غلام علی کا نام درج کر دیا گیا ہے۔ قارئین براہ کرم تصحیح فرمالیں۔

ریڈیو "صوت الاسلام" مکہ کا انٹرویو

[یہ ایک انٹرویو ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صوت الاسلام (ریڈیو مکہ) کے نمایندہ کو بتاریخ ۱۰ ذی الحج ۸۲ھ مکہ معظمہ کے شبرا ہوٹل میں دیا تھا۔ خ ح]

نمائندہ صوت الاسلام کے سوالات:

(۱) مجھے معلوم ہے کہ آپ رابطہ عالم اسلامی کے اجتماع میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے ہیں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے جناب کی رابطہ کے متعلق رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) اس سال کے حج میں جناب نے کیا محسوس فرمایا، کوئی غیر معمولی بات ہو تو ارشاد فرمائیں۔

(۳) مسلمانوں کے عام طور سے دینی انحطاط کا سبب آپ کی نظر میں کیا ہے اور اس کا کیا علاج ہے؟

مولانا محترم کے جوابات:

(۱) میں آپ کے خیر مقدم کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس سال پھر مجھے ان بلاد مقدسہ کی زیارت اور حج کا شرف عطا فرمایا اللہ سے دعا ہے کہ وہ بار بار یہاں آنے اور ہر سال حج و عمرہ ادا کرنے کی سعادت بخشے۔

رابطہ عالم اسلامی کی بنا ابھی پچھلے سال ہی ڈالی گئی تھی۔ گزشتہ ایک سال میں کچھ ابتدائی کام ہوا ہے جس کی رپورٹ رابطہ کے جنرل سیکرٹری جناب سرور الصبان صاحب نے شائع کردی ہے۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ اب جلدی ہی بڑے پیمانے پر کام شروع ہو جائے گا۔ فی الواقع عالم اسلامی کے درمیان ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے مکہ معظمہ سے زیادہ موزوں مقام کوئی نہیں ہے کیونکہ اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے خود دنیائے اسلام کا مرکز بنا رکھا ہے اور اسی طرح موتمر عالم اسلامی منعقد کرنے کے لیے بھی حج کے موسم سے زیادہ موزوں موقع اور کوئی نہیں ہے، اس لیے کہ پہلے ہی دنیا بھر کے مسلمان اس موقع پر پہنچ کر یہاں

آتے ہیں اور ان میں اہل علم اور اصحاب فکر اور اکابر امت کی ایک بڑی تعداد موجود ہوتی ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے پیش نظر انہی مواقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا تو انشاء اللہ یہ ادارہ بڑی مفید خدمت انجام دے گا۔

(۲) اس سال دنیا بھر کے حاجیوں کو اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ ترکی اور الجزائر سے حجاج کی بہت بڑی تعداد حج کے لیے آئی ہے۔ ترکی سے آنے والے حاجیوں کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے جن میں بکثرت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں اور ان کے دینی جذبے اور شغف کو دیکھ کر لوگ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ الجزائر کے مسلمان اس سال پہلی مرتبہ آزادی کی فضا میں حج کے لیے آئے ہیں اور حکومت الجزائر کے جھنڈے کے ساتھ ان کی ہسپتال کی گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ فرانس کی حکومت کے زمانے میں بہت ہی کم الجزائریوں کو حج نصیب ہوتا تھا۔ مگر اس سال خدا کے فضل سے ۶ ہزار الجزائری حج کے لیے آئے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ وہ اس سے بھی زیادہ تعداد میں آیا کریں گے۔

سعودی حکومت کی طرف سے حجاج کی سہولت کے انتظامات روز بروز ترقی پر ہیں۔ سات سال پہلے میں نے جب اوّل مرتبہ حج کیا تھا اس وقت کی حالت اور اب کی حالت کا مقابلہ کر کے دیکھتا ہوں تو بڑا فرق نظر آتا ہے۔ اب مکہ معظمہ اور منیٰ اور عرفات میں پانی کی وہ مشکلات ختم ہو چکی ہیں جو پہلے تھیں۔ منیٰ اور عرفات کے لیے بہت سے نئے راستے بن چکے ہیں جن کی وجہ سے حجاج کی آمد و رفت میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ مکے اور جدے کے درمیان آمد و رفت کی دو الگ الگ سڑکیں بن جانے کی وجہ سے بھی بہت سی مشکلات رفع ہو گئی ہیں۔ سب سے بڑھ کر حرم پاک کی توسیع ہے جس نے حاجیوں کو بڑا آرام پہنچایا ہے اور امید ہے کہ دو سال بعد تعمیر حرم کی جب تکمیل ہو جائے گی تو انشاء اللہ تمام حاجی بہت سکون کے ساتھ نماز ادا کر سکیں گے۔ مزید برآں جو ایسے ہیں جو حاجیوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں ان کے بارے میں مجھے یہ معلوم کر کے بہت اطمینان ہوا ہے کہ سعودی حکومت ان سب کو رفع کرنے کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔

(۳) مسلمانوں کے دینی انحطاط کا سب سے بڑا سبب میرے نزدیک، وہ عام جہالت ہے جو

مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے جنوب تک تمام دنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بہت ہی قلیل تعداد کو چھوڑ کر ہمارے عوام اور خواص سب ہی اسلام کی تعلیمات سے ناواقف ہیں اور اپنے دین کے متعلق وہ ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے جو مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے بالکل ناگزیر ہیں۔ اس فقدانِ علم کے ساتھ دوسری ایک مصیبت بھی شامل ہو گئی ہے اور وہ اسلامی تربیت کی کمی ہے۔ جب تک ہمارا معاشرہ بحیثیت مجموعی اسلامی طور طریقوں پر قائم رہا، ایک بچہ اس معاشرہ میں رہ کر خود بخود بہت سی ایسی باتیں اور عادتیں سیکھ لیتا تھا جو کسی دوسرے شخص کو بہت سی کتابیں پڑھنے کے بعد معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے معاشرے میں کتابی علم کی کمی کا مداوا بہت کچھ اجتماعی تربیت سے ہو جاتا ہے۔ لیکن اب دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کے اندر اس طرح کا معاشرہ باقی نہیں رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عادتیں اور خصلتیں عام طور پر اسلام کے رنگ سے عاری ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ اس وقت شدید ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر اسلام کا علم پھیلایا جائے اور جو لوگ بھی ہمارے اندر اہلِ خیر و صلاح باقی ہیں وہ لوگوں کو اسلامی تربیت دینے کی طرف توجہ کریں۔

خلافت کے مسئلہ میں جمہور کا مسلک

از: محمد احمد ابو زہرہ[1] - ترجمہ: محمد عبد الحق انصاری

جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ امت کے لیے امام کا ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے جو جماعت کی شیرازہ بندی اور تنظیم کا ذمہ دار ہو۔ جو حدود قائم کرے۔ اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کر کے فقراء پر خرچ کرے۔ سرحدوں کی حفاظت کرے۔ مقدمات کے فیصلہ کے لیے قاضی مقرر کرے۔ انتشار دور کرے اور اتحاد و یک جہتی پیدا کرے۔ شریعت کے احکام نافذ کرے اور اسلام نے جس مثالی معاشرہ کا نصب العین پیش کیا ہے اس کی تعمیر و تشکیل کے لیے جد و جہد کرے۔ اس بات پر ساری امت مسلمہ متفق ہے اور صدر اسلام میں اسی پر عمل رہا ہے۔

امام کے لیے جمہور نے چار چیزیں ضروری قرار دی ہیں جن کی پابندی سے اس کی امامت خلافت نبوی کہلانے کی مستحق ہوتی ہے اور جابرانہ بادشاہت (ملک عضوض) سے ممتاز ہوتی ہے۔

وہ چار چیزیں یہ ہیں:-

(۱) قرشیت (۲) بیعت (۳) شوریٰ (۴) عدالت۔

۱۔ قرشیت

امام کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قرشی ہو۔ قرشیت کو امامت کے لیے شرط قرار دینے کی وجہ وہ آثار و احادیث ہیں جو قریش کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں جن کا واضح اشارہ یہ ہے کہ امارت

---

[1] یہ مضمون مصنف کی کتاب "المذاہب الاسلامیۃ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے جس کا عنوان ہے "مذہب الجمہور فی الخلافۃ" (صفحات ۱۳۱ - ۱۵۸)

قریش میں ہوگی۔ ان میں سے بعض حدیثیں یہاں درج کی جاتی ہیں[۱]:

لایزال ھذا الامر من قریش ما بقی من الناس اثنان۔

یہ امر (خلافت) قریش میں اس وقت تک رہے گا جب تک دو آدمی بھی باقی رہ جائیں گے۔

صحیحین میں آیا ہے:

الناس تبع لقریش فی ھذا الشان مسلمھم تبع لمسلمھم وکافرھم تبع لکافرھم۔

لوگ اس امر میں قریش کے تابع ہیں مسلمان قریش کے مسلمانوں کے تابع اور کافر ان کے کافروں کے تابع۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے:

الناس تبع لقریش فی الخیر والشر۔

لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔

امام بخاری حضرت معاویہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا کہ:

ان ھذا الامر فی قریش لایعادیھم احد الاکبہ اللہ فی النار علی وجھہ ما اقاموا الدین

یہ امر قریش ہی میں رہے گا جو کوئی بھی ان کی مخالفت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے آگ میں اوندھے منہ ڈال دیگا (اور ایسا اس وقت ہوتا رہے گا) جب تک کہ قریش دین کو قائم رکھیں گے۔

بلاشبہ یہ نصوص قریش کی فضیلت اور بزرگی حسب پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی فضیلت کے لیے تو یہی کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں پیدا ہوئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان نصوص سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلافت قریش ہی میں ہونی چاہیے اور غیر قریشی اس کے اہل نہیں؟ کیا امامت کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خلیفہ ان ہی میں سے ہو؟ بلاشبہ عملاً ایسا ہی تھا کہ خلیفہ قریشی ہوتا تھا۔ چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ میں مومنین اولین نے مہاجرین قریش ہی میں سے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور ایسا حضرت ابوبکر کے خطبہ کے بعد ہوا۔ مگر قریش میں سے خلیفہ منتخب کرنے کی تحریک مذکورہ بالا نصوص پر قائم نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد دوسری چیزوں پر تھی۔

[۱] ابن تیمیہ: منہاج السنہ: ج ۵ ص ۳

پہلی بات انصار پر مہاجرین کی فضیلت ہے۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں مہاجرین اور انصار کا ذکر کیا ہے ہمیشہ مہاجرین کو انصار پر مقدم رکھا ہے۔ پھر یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ اسلام کی راہ میں تکلیف اٹھانے اور آزمائشوں میں صبر کرنے کے معاملہ میں مہاجرین کو انصار پر فوقیت حاصل تھی۔

دوسری بات یہ کہ ظہور اسلام اور قبل اسلام دونوں ہی ادوار میں قریش کو سارے عرب میں بلند مقام حاصل تھا۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے خطبے کے آخر میں فرمایا: "عرب صرف قبیلۂ قریش کی قیادت قبول کر سکتے ہیں"۔ یہ عبارت واضح طور پر قریش کی افضلیت کی وجہ بیان کرتی ہے۔

قریش کی فضیلت میں جو حدیثیں مروی ہیں ان سب کا مفہوم یہی ہے۔ سوائے حضرت معاویہ کی حدیث کے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ائمہ قریش میں سے ہوں گے اور اگر کوئی غیر قرشی امامت کا مدعی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل گرا دے گا۔ سوال یہ ہے کہ یہ حدیث حقیقت واقعہ کی پیشین گوئی ہے یا حکم ہے اور اگر حکم ہے تو کیا یہ حکم فرض ہے؟ اس کی تحقیق ضروری ہے۔ بعد کو جو کچھ واقعتہً پیش آیا وہ یہ تھا کہ امامت حقہ قریش ہی میں رہی جس کے نمائندے خلفاء اربعہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم تھے جو قرشی تھے اور ائمہ ہی کہلاتے اس پر مزید یہ کہ حدیث مذکور نے امام کے قرشی رہنے کی یہ شرط بیان کی ہے کہ جب تک وہ دین قائم کریں گے۔ چنانچہ فرمایا ما اقاموا الدین۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب قریش دین قائم نہیں کریں گے تو ان سے امامت چھین لی جائے گی اور اس کے سپرد کر دی جائے گی جو اس کو قائم کرے گا۔

اسی بنا پر ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان اخبار و آثار سے یہ بات قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی کہ امامت ضرور ہی قریش میں ہونی چاہیے اور یہ کہ غیر قرشی کی امامت خلافت نبوی نہیں ہو سکتی۔ بالفرض اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیثیں فرمائش کی حیثیت رکھتی ہیں، یعنی یہ کہ امامت قریش میں ہونی چاہیے تو بھی یہ فرمائش فرضیت کا حکم نہیں رکھتی۔ بلکہ اس کا ماحصل یہ ہے کہ قریش کو خلافت کے معاملہ میں ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔ نہ یہ کہ غیر قرشی کی خلافت سرے سے جائز ہی نہیں ہوتی۔ یہ رائے اس وقت ہے جب کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ احادیث فرمائش

کا حکم رکھتی ہیں ، اس مفہوم میں فرمائش ترجیح اور عدم ترجیح سے متعلق ہوگی نہ کہ جواز اور عدم جواز سے ، کیونکہ صحیحین میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ :

" ان خلیلی اوصانی ان اسمع واطیع وان ولی علیکم عبد حبشی مجدع الانف " — میرے رفیق (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے اس بات کا حکم دیا کہ میں ہر حال میں سمع وطاعت اختیار کروں خواہ ہم پر کوئی نکٹا حبشی غلام ہی والی کیوں نہ بنا دیا جائے ۔

بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ — تم سمع وطاعت کی روش پر قائم رہو خواہ تمہارا والی ایسا حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو جس کا سر سانپ کے پھن کی طرح ہو ۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ام الحصین نے رسول اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا :

ان امر علیکم عبد اسود مجدع یقود کم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا ۔ — اور اگر تم پر کوئی نکٹا سیاہ فام غلام والی مقرر کیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری رہنمائی کرے تو اس کی بات سننا اور اس کی طاعت کرنا ۔

اگر ان نصوص کو حدیث " ان ھذا الامر فی قریش " کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سارے نصوص بحیثیت مجموعی یہ واجب قرار نہیں دیتے کہ امامت قریش ہی میں ہونی چاہیے اور یہ کہ کسی غیر قرشی کی امامت جائز نہیں ہو سکتی ۔ غیر قرشی کی امامت بلاشبہ جائز ہے اور حدیث " الامر فی قریش " مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کی مثال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ :

الخلافۃ بعدی ثلاثون ثم تصیر ملکا عضوضا — خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی ۔ اس کے بعد جابرانہ بادشاہت (ملک عضوض) آجائے گی ۔

یا اس حدیث سے مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ قریش کو خلافت کے لیے مقدم کرنا چاہیے، نہ یہ کہ انہیں کی خلافت جائز ہوتی ہے۔

جہاں تک حضرت ابوبکر اور آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ کرام کے قول کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اس سے قریش کے تقویٰ اور ان کی قوت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ان میں نہ ہوں اور ان کے علاوہ دوسروں میں پائی جاتی ہوں تو پھر حضرت صدیق کے استدلال کے مطابق جس پر صحابہ کرام نے اتفاق کیا، امامت کے سزاوار ہوں گے۔ کیونکہ جب قوت، وجہ شرف اور تقویٰ ہی مدارِ خیر ہے تو یہ صفتیں جس کسی میں ہوں وہی خلافت کا مستحق ہوگا۔

ابتدا میں خلافت کے قریش میں ہونے کی یہی توجیہ ہے اور یہی حقیقت ہے ان ساری روایات کی جو قریش کی شان میں وارد ہوئی ہیں۔ یہی ان کا مفہوم ہے اور یہی بنیاد ہے جس پر حضرت ابوبکر کی خلافت پر اجماع ہوا تھا۔

۲ - بیعت

جمہور نے خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو دوسری شرط لگائی ہے وہ اصحاب حل وعقد کی بیعت ہے۔ بیعت کے معنی یہ ہیں کہ اصحاب حل وعقد، فوج اور جمہور مسلمین یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کریں گے، خواہ اس کا کوئی حکم انہیں پسند آئے یا نہ آئے، بشرطیکہ وہ معصیت نہ ہو، اور خلیفہ ان سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ حدود و فرائض کو قائم کرے گا، عدل کی راہ اختیار کرے گا، اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مقاصد کو ملحوظ رکھے گا۔ صحابہ کرام نے اسی طریقے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اور اسی پر وہ قائم تھے۔ چنانچہ حدیبیہ میں درخت کے نیچے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ	جو لوگ تم سے بیعت کر رہے ہیں وہ فی الحقیقت
اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَن نَّكَثَ	اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں

فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (فتح)

پر ہے۔ تو جو بیعت کے بعد عہد توڑ دے گا اس کے عہد توڑنے کا وبال اسی پر ہوگا اور جو اس بات کو پورا کرے گا جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو بڑا اجر دے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مدینہ سے بیعت لی اور جب مکہ فتح کیا تو اہل مکہ سے بیعت لی۔ اور ان بیعت کرنے والوں میں عورتیں بھی تھیں! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (ممتحنہ)

اے پیغمبر جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس اس غرض سے آئیں کہ آپ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ بہتان کی اولاد لائیں گی جس کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (نطفۂ شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کرکے) بنا لیویں اور معروف باتوں میں آپ کے خلاف نہ کریں گی تو آپ ان سے بیعت لے لیں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں بے شک اللہ غفور الرحیم ہے۔

جب حضرت صدیقؓ نے انصار پر مہاجرین کی فضیلت واضح کی تو صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کے کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے کہا کہ آپ اپنا ہاتھ پھیلائیے میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ حضرت عمرؓ کی بیعت کے بعد مسلمان آتے جاتے تھے اور حضرت صدیق سے بیعت کرتے جاتے تھے جب حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر کو سونپنی چاہی تو ان کے لیے بھی بیعت لی۔ چنانچہ مسلمان آکر بیعت کرتے جاتے تھے۔ ایسا ہی حضرت عثمان نے کیا جب حضرت عمر کی مقررہ

کی ہوئی چھ آدمیوں کی کمیٹی نے ان کو خلافت کے لیے منتخب کیا تو انہوں نے مسجد نبوی میں اہل مدینہ سے بیعت لی۔ اسی طرح اہل مدینہ نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بنو امیہ کے پورے دور میں اور بنو عباس کے ابتدائی دور میں یہی طریقہ رہا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ صحابہ کے دور میں بیعت کی بنیاد آزادی رائے اور آزادی اطاعت پر قائم تھی، لیکن اموی دور میں اطاعت جبری بن گئی اور بیعت کی آزادی ختم ہو گئی۔ حجاج اور اس جیسے دوسرے والیوں نے بیعت کے اندر مختلف عہدنیں اختیار کیں۔ مثلاً حجاج نے لوگوں کو بیعت کے وقت یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ہمارے غلام آزاد ہو جائیں اور ہماری عورتوں پر طلاق پڑ جائے اگر ہم خلیفہ کی اطاعت سے خروج اختیار کریں۔ اس طرح کی باتوں سے حجاج کا مقصد یہ تھا کہ لوگ خلیفہ کی مطلق اطاعت قبول کریں۔ بنو عباس کے اولین خلفاء لوگوں سے بیعت لینے کا اہتمام کرتے تھے، لیکن بیعت لینے میں وہ ساری باتیں نہیں کیا کرتے تھے جنہیں حجاج اور اس کے ساتھیوں نے اختیار کر لیا تھا۔

ابو جعفر منصور پر یہ الزام تھا کہ اس نے لوگوں سے جبراً بیعت لی۔ اس لیے والئ مدینہ نے امام مالک کو یہ فتویٰ دینے سے روکنا چاہا کہ مجبور کی قسم اور طلاق باطل ہے تاکہ اس فتویٰ سے خلیفہ کی بیعت سے آزاد ہونے کا راستہ ہموار نہ ہو۔

بیعت کا تصور اور عقد اجتماعی کا وہ نظریہ جسے جدید اہل علم نے ریاست کی بنیاد قرار دیا ہے بہت مماثل ہیں۔ فرانس کے روسو اور انگلستان کے ہابس اور لاک نے حاکم اور محکوم کے باہمی عہد کو ریاست کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس عہد کے یہ معنی ہیں کہ حاکم رعیت کے مصالح کی حفاظت کرے گا اور رعیت حاکم کی اطاعت کرے گی اور اس کے عائد کردہ ٹیکسوں کی ادائیگی کرے گی۔ ان مفکرین کے درمیان عقد اجتماعی کے حدود کے بارے میں اختلاف ہے کہ حاکم کے اوپر کیا چیزیں فرض ہیں۔ مسلمان اہل علم فطرت مستقیمہ اور اسلامی نظام جماعت کی رہنمائی میں اس تصور تک پہنچے اور انہوں نے اس کو حقیقت واقعہ بنا دیا۔ ان کے لیے اس عقد کی حیثیت ایک مفروضہ کی نہ تھی بلکہ وہ اسے ایک عملی حقیقت سمجھتے تھے۔ ان کے تصور کے مطابق اس عقد کی گرفت حاکم پر بمقابلہ محکوم زیادہ سخت اور مضبوط تھی، کیونکہ ان کے نزدیک حاکم کی [illegible]

صرف مصلحت پر مبنی نہ تھی جیسا کہ بعض انگریز مفکرین کا خیال تھا، یا کہ بعض کے خیال میں تو حاکم وجود ایک لعنت سے کم نہ تھا اگر وہ عدل و مصلحت اور رفق و ہمدردی کا التزام نہ کرے، کتاب اللہ و سنت رسول کا پابند نہ ہو، فرائض کا قیام اور حدود کا نفاذ نہ کرے اور زمین میں فساد پیدا ہونے سے نہ روکے۔

۳۔ شوریٰ

خلافت کی تیسری شرط یہ ہے کہ امام کا انتخاب مسلمانوں کے مشورے سے ہو۔ اس مسئلہ کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت اپنی تشکیل کے اعتبار سے مشاورتی ہے۔ اس کی اساس اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ہے وامرھم شوریٰ بینھم (ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں)۔ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ "شاورھم فی الامر" [معاملات میں ان (مسلمانوں) سے مشورہ کرو] یہ آیت بھی اساس کا حکم رکھتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ ایسے معاملات میں جو عام مسلمانوں سے متعلق ہوتے تھے اور جن میں وحی کی ہدایت موجود نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے۔ مثلاً آپ ہر جنگ کے موقع پر اور جنگ کے بعد پیش آنے والے حالات میں اور حکومت کے دوسرے معاملات میں جن میں کوئی نص نہ ہوتی مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے۔ آپ کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں بھی صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا۔

چونکہ حکومت اسلامی فی الحقیقت شورائی ہے اس لیے لازم ہے کہ خلیفہ کا انتخاب بھی شورائی ہو۔ کیونکہ کوئی حکومت شورائی نہیں کہی جا سکتی اگر اس کا حاکم اعلیٰ وراثۃً اس کا مالک بنا ہو۔ وراثت اور شوریٰ دو متضاد تصورات ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

حضرت معاویہ کے اعمال میں جو عمل سب سے زیادہ قابل گرفت ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے خلافت اسلامی کو موروثی بادشاہت میں تبدیل کر دیا، اگرچہ انہوں نے اس پر بیعت کا لبادہ ڈال رکھا تھا، لیکن یہ بیعت اپنے معنی کھو چکی تھی۔ کیونکہ اس سے آزادی انتخاب کا وہ عنصر ختم ہو چکا تھا جو اس کا اصل جوہر اور مغز ہے۔ حضرت حسن بصری نے حضرت معاویہ کی حکومت کے بارے میں کہا ہے "حضرت

معاویہ میں چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ان میں ہوتی تو مہلک ثابت ہوتی۔ پہلی بات یہ کہ انہوں نے امت پر سفہاء کی فوج سے حملہ کیا اور بغیر مشورہ کے اس پر مسلط ہو گئے۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے یزید کو خلیفہ بنایا درآنحالیکہ وہ بہت بڑا شرابی تھا، ریشم پہنتا تھا اور طنبورہ بجاتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ انہوں نے زیاد کو اپنا بھائی تسلیم کر لیا حالانکہ فرمان نبوی یہ ہے کہ "الولد للفراش وللعاھر الحجر"۔ چوتھی بات یہ کہ انہوں نے حجر بن عدی کو قتل کرایا۔ حجر اور حامیان حجر کی طرف سے ان پر افسوس ہے۔

بیعت مشورہ کے بعد ہونی چاہیے اس باب میں حضرت عمر کا ایک قول ہے:

من بایع رجلا بغیر مشورة المسلمین	جس نے مسلمانوں سے مشورہ کیے بغیر بیعت لی تو نہ
فلا یبایع ھو ولا الذی بایعہ	بیعت لینے والے کی بیعت ہوئی اور نہ بیعت کرنے والے کی۔

حضرت عمر اس شخص کو امامت کے حق سے محروم کر دیتے ہیں جو امت پر زبردستی مسلط ہو جائے اور ایسے لوگوں سے بیعت لینے لگے جو اسے امام بنانے یا نہ بنانے کی آزادی نہ رکھتے ہوں۔

اس سے واضح ہو گیا کہ خلافت کے لیے شوریٰ ایک ناگزیر شرط ہے اور یہ کہ بیعت مسلمانوں کے مشورہ سے ہونی چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا طریقہ ہو بیعت اور شوریٰ کا؟ اور یہ کہ شوریٰ اور بیعت کے کون لوگ اہل ہیں؟ اس معاملہ میں اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن مجید نے شوریٰ کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر عمل رہا ہے۔ لیکن یہ بتایا نہیں گیا کہ شوریٰ

ؒ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زیاد ایک لونڈی کا بیٹا تھا جس سے ابوسفیان نے عہد جاہلیت میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور انہی کا بیان تھا کہ زیاد میرے ہی نطفہ سے ہے۔ حضرت معاویہ نے ایک مدت دراز تک تو اپنے والد کے اس بیان کی بنیاد پر زیاد کو اپنا بھائی قرار نہیں دیا، مگر جب زیاد کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتیں نمایاں ہوئیں تو انہوں نے باقاعدہ اعلان کیا کہ زیاد میرا بھائی ہے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشاد کی رُو سے ولد الزنا کا نسب ثابت نہیں ہوتا۔ (ادارہ)

کا طریقہ کیا ہو اور نہ یہ کہ کون لوگ مشورہ کے اہل ہیں۔ اس کام کو خود لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ شوریٰ کی تنظیم اور اس کے طریقوں کی تشکیل کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقے زمان و مکان اور قوموں کے حالات کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ جو طریقہ ایک زمانہ میں کارآمد ہوتا ہے وہ دوسرے زمانہ میں مفید نہیں ہوتا، اور جو صورت ایک قوم کے لیے موزوں ہوتی ہے وہ دوسری قوم کے حسب حال نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے شوریٰ کا حکم دیا ہے جیسا کہ عدل کا حکم دیا ہے اور اسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان دونوں مقاصد کے حصول کے لیے جو بہترین طریقہ ہو اسے خود اختیار کریں۔

مسلمانوں میں خلیفہ کے شورائی انتخاب کے تین طریقے رائج تھے۔ ان کی طرف ہم نے اس سے پہلے اشارہ کیا ہے۔ یہاں ان کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا جائے گا۔

پہلا طریقہ تو یہ تھا کہ مشورہ سے آزادانہ طور پر کسی ایک فرد کو منتخب کر لیا گیا بغیر اس کے کہ اس کے حق میں کسی کی وصیت ہو۔ یہی طریقہ تھا جس سے ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ لوگوں کو انتخاب میں پوری آزادی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں کوئی وصیت نہیں فرمائی تھی۔ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرض الموت میں نماز کی امامت کے لیے مقرر کیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود صحابہ نے اس کام کے لیے حضرت صدیق کو منتخب کیا۔ بہرحال صحابہ کرام نے یہ سوچا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے کام کے لیے ان کو پسند فرمایا ہے۔ تو ہم ان کو اپنے دنیا کے کام کے لیے کیوں نہ اختیار کریں۔ اگر یہ نتیجہ صحیح بھی ہو تو بھی اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے وصیت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اگرچہ اس واقعہ میں حضرت صدیق کی فضیلت کی طرف کھلا ہوا اشارہ ہے اور اس مقام بلند کی نشاندہی ہے جو آپ کو صحابہ کے درمیان حاصل تھا مگر اس کو خلافت کے حق میں وصیت سمجھنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اس واقعہ میں نہ اس کی تصریح ہے اور نہ اس کی طرف کوئی دعوت۔ مزید یہ کہ حضرت صدیق کی امامت کا کوئی ذکر سقیفہ بنی ساعدہ کی گفتگو میں نہیں آیا جس میں خلیفہ رسول کے انتخاب کا

مسئلہ طے ہوا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ ان کی نماز میں امامت اس بات کے لیے محرک بنی کہ جب حضرت عمر نے ان سے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا تو لوگ جوق در جوق ان کی بیعت کو آنے لگے اور ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کرنے لگے۔ بہرحال جو بات بھی ہو اس امر پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی وصیت نہ تھی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ کسی فرد کو اپنی جانشینی کی وصیت کر جائے جو اس سے قریب ہو مگر اس کا رشتہ دار نہ ہو۔ یہ وہ صورت ہے جو حضرت عمر کی خلافت میں پیش آئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے لیے وصیت فرمائی لیکن یہ وصیت ان کی طرف سے ایک تجویز کی حیثیت رکھتی تھی اور کسی طرح بھی واجب نہ تھی۔ صورت حال یہ تھی کہ ارتداد کا وہ فتنہ جو سارے بلاد عربیہ میں پھیل گیا تھا کچھ عرصہ ہی ہوا کہ فرو ہوا تھا۔ ابھی اسلامی فوجیں جہاد میں مشغول تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو خطرہ تھا کہ خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوگا۔ انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ کا اختلاف دیکھا تھا۔ انہی وجوہ اور حالات کی روشنی میں انہوں نے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا جو ان کے رشتہ دار نہ تھے۔ حضرت صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو جانشین مقرر کرنا چاہا تو اس سے صرف مسلمانوں کی خیر خواہی اور دین کی بھلائی پیش نظر تھی۔ اس لیے جب آپ نے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا تو مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنی رضامندی اور آمادگی کا اظہار کیا۔ حضرت صدیقؓ کی تجویز پر بحث ہوئی۔ مگر جب یہ علم ہو گیا کہ جو آپ نے کیا ہے وہ حق ہے تو سب نے مل کر حضرت عمرؓ کو بخوشی خلیفہ تسلیم کر لیا۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ قوم کے بہترین افراد میں سے چند افراد کی ایک کمیٹی مقرر کرے جو اپنے درمیان سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک طرف رسول اللہؐ کا اسوہ تھا کہ آپ نے کسی کے لیے وصیت نہیں کی۔ دوسری طرف حضرت ابوبکر کا طریقہ تھا کہ آپ نے وصیت فرمائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے سوچا کہ اگر میں وصیت کروں تو مجھ سے بہتر ہستی نے وصیت کی ہے اور وصیت نہ کروں تو مجھ سے افضل ذات نے وصیت نہیں کی۔ چنانچہ انہوں نے درمیان کی راہ اختیار کی اور چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی کہ وہ اپنے میں سے ایک کو باہمی مشورہ سے خلیفہ

منتخب کرلیں۔ اس کمیٹی نے حضرت عثمان کو منتخب کیا۔ پھر لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ چھ افراد کی اس کمیٹی نے باہمی مشورے سے جو نام تجویز کیا اس کی حیثیت تجویز کی تھی۔ اس کا تسلیم کرنا عامۃ المسلمین پر واجب نہ تھا۔ اگر حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر مسلمان بیعت نہ کرتے تو یقیناً وہ خلیفہ نہ ہوتے۔ محض تجویز کر دینے سے کوئی فرد خلیفہ نہیں بن جاتا۔ خلافت ایسی بیعت سے متحقق ہوتی ہے جو آزادانہ انتخاب کی مظہر ہو۔ اسی سے ولایت مکمل ہوتی ہے اور اسی سے امامت ثابت ہوتی ہے۔

ابن حزم کا قول ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کے یہی تین طریقے ہیں۔ ان تینوں طریقوں کے علاوہ کوئی اور طریقہ اُن کے خیال میں جائز نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے کو وہ صحابہ کے اجماع کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ صحابہ نے یہی تین طریقے اختیار کیے اور اسی پر وہ راضی تھے اس لیے یہی اُن کا اجماع ہے۔

مگر صحیح رائے یہ ہے کہ صحابہ نے یہ تینوں طریقے اپنے زمانے میں شورائی انتخاب کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔ دوسرے زمانوں کے لوگوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لیے جو طریقہ چاہیں اختیار کریں، بشرطیکہ اسے امت کی تائید حاصل ہو اور لوگ اپنے لیے ایسا امام منتخب کریں جو حدود الٰہی کو قائم کرے۔ (باقی)

نقاب میں چھپا ہوا ہے"

انہی معتقدات کی بیخ کنی کی کوشش کے نتیجہ میں روسی مسلمان جور و جبر کی ایک خاص مہم کا ہدف بن گئے ہیں۔ اس مہم میں اسلام کے خلاف گوناگوں اور کارگر حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ لینن نے حکم دیا کہ عوام کے سامنے دہریت کے پرچار کے لیے زیادہ سے زیادہ مختلف النوع مواد پیش کیا جاتے۔ ان کو زندگی کے مختلف شعبوں کے حقائق سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا جاتے۔ ہر ممکن طریقے سے انہیں اپنی طرف راغب کرنے اور مذہبی نشے سے آزاد کرنے کی کوشش کی جاتے۔ اور ہر پہلو سے ان کو بیدار کرنے کے لیے نو بہ نو طریقے اختیار کیے جائیں۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے میں مسلمان اہلِ علم و دانش کی عام جلاوطنی نے مسلم ریاستوں میں قیادت و رہنمائی کو ضعف پہنچایا۔ اس کے بعد دوسری جنگِ عظیم کے خاتمہ کے قریب ایک اور جلاوطنی عمل میں آئی۔ اس مرتبہ تمام کریمیائی ترک اپنے وطنوں سے غائب کر دیئے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں کاکیشیائی اور کریمیائی مسلمانوں کا استیصال کر دیا گیا۔ اور دوسری طرف ہزارہا اشتراکی العقیدہ سلافی روسیوں کو مسلمان علاقوں میں دباؤ ڈالنے کے پروگرام کے تحت بھر دیا گیا تاکہ مسلمان قوم کی مرکزیت کو تحلیل کیا جا سکے۔ مسلمان پہلے ہی اپنے اہلِ علم و دانش سے محروم ہو چکے تھے لہٰذا اس بھرمار کے اثرات ان پر بہت گہرے پڑے۔

مملکتِ روس کے مسلم علاقے چار مذہبی انتظامی حلقوں میں منقسم ہیں جن میں سے ہر ایک کا سربراہ ایک مفتی ہوتا ہے۔ یہ حلقے داخلی اور خارجی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ مفتی اور واعظ کمیونسٹوں کے زیرِ نگرانی مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات اور روایات کی صریح خلاف ورزی پر مجبور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۱ مئی ۱۹۵۶ء کو رمضان کے مہینے میں ماسکو کی مسجد کے امام نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ روزہ نہ رکھیں کیونکہ روزے کی فرضیت قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اسٹالن کی موت کے موقع پر تاشقند کے مفتی مادجی خان نے جو تار ارسال کیا تھا وہ بھی روسی مفتیوں کو اشتراکی مفادات کے لیے آلۂ کار بنانے کی ایک واضح مثال ہے۔ مفتی صاحب کے تار کے الفاظ یہ تھے

وسطی ایشیا اور قازقستان کے مذہبی انتظامی حلقے کے صدر، مسلمان اور میں ذاتی طور پر، دنیا کے روشن دماغ فائدار ومتبلغ، اپنے محبوب باپ جے۔وی۔ اسٹالن کی موت پر اور اس نقصان پر جو ہمارے ملک کے عوام کو پہنچا ہے آپ کے صدمہ میں برابر کے شریک ہیں"۔

اس کے ساتھ ہی روسی حکومت ان مذہبی انتظامی حلقوں کو بیرونی دنیا میں یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال کرتی ہے کہ اسلام پوری طرح آزاد ہے اور مسلمانوں کو اپنے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی پوری آزادی ہے۔ ماسکو ریڈیو سے مفتیوں کی تقریریں اور نمازیں نشر کی جاتی ہیں۔ یہ روسی مفتی دوسرے مسلمان ملکوں سے آنے والی ممتاز شخصیتوں کا استقبال کرتے ہیں، انہیں مسجدیں دکھاتے ہیں اور نمازوں کے موقعوں پر انہیں لے جاتے ہیں۔ حاجیوں کو مکہ جانے کی اجازت ہے مگر یہ حاجی بڑی احتیاط کے ساتھ چنے جاتے ہیں۔ اور ان کے ویزا صرف اسٹیٹ سیکیورٹی اتھارٹی جاری کرتی ہے۔ زاروں کے زمانہ میں جن حاجیوں کی تعداد ہر سال ہزاروں تک پہنچتی تھی انہیں حاجیوں کی تعداد اب کل بیس ہے۔

انقلاب کے بعد کے برسوں میں مسجدوں کا ایک بہت بڑا حصہ اور عربی مدارس تمام کے تمام بند کر دیئے گئے۔ تاہم بیرونی پروپگنڈے کی خاطر چند مساجد کھول دی گئیں۔ اور جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس وقت صرف دو عربی مدرسے موجود ہیں: ایک تاشقند میں اور دوسرا بخارا میں۔

جب روسی حکومت نے سیاسی آزاد خیالی کے دعوے کے ساتھ ابتداءً مذہب کے ساتھ عام تعرض شروع کیا تو مذہبی عقیدے اور عمل کی آزادی بتدریج ختم کر دی گئی۔ اسلام اور علماء پر جبر و اکراہ کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا اور پھر ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۴ء میں اشتمالیت کی ابتدا کے ساتھ ایک باقاعدہ مہم کی صورت میں اس جبر و اکراہ میں شدت پیدا کی گئی۔ اور یہ مہم درجہ بدرجہ آگے بڑھتی رہی۔

سب سے پہلے مذہب کے تمام اشاعتی ادارے ضبط کر لیے گئے اور مذہبی لٹریچر کی اشاعت انقلاب دشمن قرار دے کر ممنوع کر دی گئی۔ دینی کارکنوں پر "کاہل" ہونے کا ٹھپہ لگا دیا گیا اور

روسی قانون کے تحت ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس کے بعد عربی رسم الخط کی باری آئی اور اس کی جگہ پہلے لاطینی رسم الخط رائج کیا گیا اور بعد ازاں سریلی۔ آخر کار معاشی قوانین نافذ کیے گئے۔ ان قوانین میں بھاری ٹیکس اور اشیاء کی سرکاری خریداری کے کوٹے شامل تھے۔ یہ کوٹے اتنے زیادہ تھے کہ ان کا پورا کرنا ناممکن تھا۔ نادہندگی کی صورت میں سوویٹ کریمنل کوڈ کی دفعہ ۱۰۷ کے تحت سزا دی جاتی اور جلاوطن کیا جاتا تھا۔

دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ خفیہ پولیس کے ذریعہ سے علماء پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ ایک تیار شدہ بیان پر دستخط کریں جس میں اسلامی عقائد سے دستبرداری کا اعلان تھا، تاکہ عوام کے لیے ایک مثال قائم ہو جائے۔ جب علماء کی اکثریت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو غیر معمولی کارروائیاں عمل میں لائی گئیں اور علماء اور ائمہ مساجد کو دور دراز علاقوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔

۱۹۱۸ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان بے شمار مدارس اور مساجد علماء اور اساتذہ کی جلاوطنیوں کے نتیجہ میں بے آباد اور ویران ہو گئے۔ حکومت نے انہیں ضبط کر لیا اور پھر یا تو ان کو سرکاری استعمال میں لے لیا گیا اور یا ڈھا دیا گیا۔

اب جو مسلمان بچے روسی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں ان کے ذہن میں ہر موقع پر اسلام کے خلاف زہر بھرا جاتا ہے۔ اور بچوں کے ذریعہ سے یہ زہر مسلمان گھرانوں میں نفوذ کرتا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے عقائد کی بیخ کنی کے لیے منظم اور سائنٹفک پروپگنڈے کا فریب کارانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے بہت سے دہریت آفریں ادارے قائم کیے گئے ہیں جن میں باقاعدہ طور پر پروپگنڈا کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ترکمان کے صدر مقام عشق آباد میں سائنٹفک دہریت کی یونیورسٹی (UNIVERSITY OF SCIENTIFIC ATHEISM) قائم کی گئی۔ دہریت کی علاقائی مجالسِ مذاکرہ (REGIONAL ATHEIST SEMINARS) قائم کی گئیں جنہوں نے ۱۹۵۹ء کے ابتدائی تین مہینوں میں دہریت کے دو سو اٹھارہ مبلغین کو تعلیم و تربیت دی۔ ترکمان اسٹیٹ یونیورسٹی کے ساتھ سائنٹفک دہریت کا ایک سیکشن قائم کیا گیا۔ مسلمان ریاستوں

کے طول و عرض میں دہریت کے مبلغین کو تربیت دینے کے لیے مجالس مذاکرہ اور ریفریشر کورس منعقد کیے جاتے ہیں۔ اور یہ مبلغین مذہب کے خلاف بالعموم اور اسلام کے خلاف بالخصوص پروپگنڈے کی ایک منظم مہم چلاتے ہیں۔

سیاسی اور علمی معلومات کے فروغ کی خاطر جا بجا روس میں مذہب دشمن ادارے قائم کیے گئے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ عمارات منتخب کی گئی ہیں جو کبھی مساجد تھیں۔ ان اداروں میں تقاریر اور مجالس مباحثہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ طریقۂ کار یہ ہے کہ پروپگنڈا کے ماہرین مذہبی خیالات رکھنے والے اشخاص سے فرداً فرداً گفتگو کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اس لحاظ سے بہت کامیاب ثابت ہوا ہے کہ اگر شخص مذکور دہریت کو قبول نہ کرے تو علاقہ کی کمیونسٹ پارٹی کے رکن کی خاص توجہات اس شخص کے حق میں ناخوشگوار نتائج پیدا کرتی ہیں۔

۱۹۵۸ء میں موقع پر جو معلومات فراہم کی گئیں ان کی رو سے سوویٹ یونین میں مسلمانوں اور اسلام پر متعدد پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ روس میں اس وقت ایک بھی پرائمری اسکول ایسا نہیں ہے جس میں مسلمان بچوں کو ان کے مذہب کے اصول پڑھائے جاتے ہوں۔ روسی مسلمان کوئی مذہبی کتاب چھاپنے کے مجاز نہیں ہیں۔ نہ وہ کوئی ایسی کتاب ہی چھاپ سکتے ہیں جس میں مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور روایات کا ذکر کیا گیا ہو۔ روس میں کوئی ایسی مسجد یا مذہبی ادارہ نہیں ہے جو حکومت کی نگرانی سے آزاد ہو۔ روسی مسلمان کسی مسجد کی وقف جائداد کی آمدنی کو مذہبی تعلیم یا مسجد کے اخراجات پر صرف کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ روس میں اسلامی علوم کی نہ تعلیم دی جاتی ہے نہ تعلیم دینے والے موجود ہیں۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار دوسرے حربے ہیں جنہیں کمیونسٹ پارٹی کے دہریے سرزمین روس سے مذہب کی بیخ کنی کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اخبارات، ریڈیو اور کتابوں کے ذریعے ایک لامتناہی سلسلہ مذہب کے خلاف تمسخر و استہزاء اور ترغیب و ترہیب کا جاری ہے۔ یہ لاچار و مجبور مسلمان خود اپنے ہی ملک میں ایک ایسی بیرونی طاقت کی قہرمانی کے زیر سایہ جی رہے ہیں

جو نہ صرف یہ کہ انہیں ان اصولوں اور طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی نہیں دیتی جو پچھلے ایک ہزار برس سے ان کا سرمایۂ حیات ہیں بلکہ وہ ان کے مذہب، تہذیب اور روایات ہر چیز کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

ہم دنیا کے تمام آزاد لوگوں سے خواہ وہ کسی مذہب اور عقیدے سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں، اپیل کرتے ہیں کہ وہ آہنی پردے کے پیچھے ظلم و تعدی کی چکی میں پستی ہوئی اس اقلیت کی حمایت میں ہمارے ساتھ شریک ہوں اور اجتماعی ذمہ داری کا اعلان کریں۔

مسٹر خروشیف کوئی موقع نہیں جانے دیتے جب کہ وہ عوام کے حق خود ارادیت کی زور شور سے حمایت نہ فرماتے ہوں۔ انہوں نے اپنے ایک بیان میں یہاں تک کہا ہے کہ اگر روس کی مسلمان جمہوریتیں چاہیں تو وہ یونائیٹڈ سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک سے علیحدہ ہو سکتی ہیں۔ براہِ کرم اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ استصواب کرو۔ اگر مسلمان جمہوریتوں کے عوام کی یہ خواہش معلوم کر لی جائے اور اگر ان کے باشندے علیحدہ ہونا چاہیں تو پھر مسٹر خروشیف کو اپنے دعووں کو عملی جامہ پہنانے سے گریز نہ کرنا چاہیے۔

ترجمہ: عمر فاروق

ضروری اعلان

خریدار حضرات خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ ان کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ ورنہ عدمِ تعمیل کی شکایت کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا۔

مینیجر ترجمان القرآن

رسائل و مسائل

امر بالمعروف کا فریضہ کیسے انجام دیا جائے؟

سوال۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں ایک عرصے سے پریشان ہوں نہی عن المنکر کے متعلق جب میں احکام کی شدت کو دیکھتی ہوں اور دوسری طرف دنیا میں منکر کا جو حال ہے اور جتنی کثرت ہے اس کا خیال کرتی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان احکام پر کیسے عمل کیا جائے۔ اگر برائی کو دیکھ کر خاموش رہنے کے بجائے زبان سے منع کرنا مطلوب ہو (کیونکہ ہاتھ سے نہ سہی مگر زبان سے کہنے کی قدرت سوائے شاذ صورتوں کے ہوتی ہی ہے) تو پھر تو انسان ہر وقت اسی کام میں رہے، کیونکہ منکر سے تو کوئی جگہ خالی ہی نہیں ہوتی لیکن بڑی رکاوٹ اس کام میں یہ ہوتی ہے کہ جس کو منع کیا جائے وہ کبھی اسے اپنی خیر خواہی پر محمول نہیں کرتا بلکہ الٹا اسے ناگوار ہوتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہی ہے کہ چاہے کسی کو کتنے ہی نرم الفاظ میں اور خیر خواہانہ انداز میں منع کیا جائے مگر وہ اس کو کبھی پسند نہیں کرتا بلکہ کوئی تو بہت بے توجہی برتے گا، کوئی کچھ الٹا ہی جواب دیگا، اور اگر کسی نے بہت لحاظ کیا تو سن کر چپ ہو رہا۔ مگر ناگوار اسے بھی گزرتا ہے اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔

مثلاً ہم راہ چلتے میں کسی عورت کو بے پردہ دیکھتے ہیں تو اگر اس کو سر راہ ہی منع کیا جائے تو دوسرا کونسا موقع ہمیں ایک ناواقف عورت کو سمجھانے کا مل سکے گا۔ کیا راستے میں روک کر سمجھانا آپ کے نزدیک مناسب ہے؟ اسی طرح جس عورت کا چال چلن درست نہ ہو اس کو کیسے نصیحت کی جائے؟ چاہے کوئی عورت کتنی ہی رسوائے زمانہ ہو لیکن

نصیحت کرو تو بُرا مانے گی۔ اگر درس یا اجتماع میں بلایا جاتے تو کبھی نہیں آتے گی۔
پھر ان کے معاملہ میں اس فریضہ کو ادا کرنے کی صورت کیا ہو؟ آخر میں اس بارے میں بھی
آگاہ فرمائیں کہ عورت کے لیے کیا مردوں پر تبلیغ کرنا بھی ضروری ہے؟

جواب ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم عام ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے میں آدمی کو حکمت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ موقع و محل کو دیکھے بغیر ہر جگہ ایک ہی لگے بندھے طریقے سے اس کام کو کرنے سے بعض اوقات اُلٹا اثر ہوتا ہے۔ میرے لیے اس کا کوئی ایسا طریقہ بتا دینا مشکل ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے عمل کر سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود آہستہ آہستہ اپنے تجربات سے سبق حاصل کریں اور رفتہ رفتہ اپنے اندر اتنی حکمت پیدا کریں کہ ہر موقع اور ہر آدمی اور ہر حالت کو سمجھ کر امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کی خدمت انجام دینے کا ایک مناسب طریقہ اختیار کر سکیں۔ اس کام میں اوّل اوّل آپ سے بھی غلطیاں ہوں گی، اور بعض مواقع پر غلطی آپ کی نہ ہو گی مگر دوسرے شخص کی طرف سے جواب نامناسب ہو گا۔ لیکن یہی تجربات آپ کو صحیح طریقہ سکھاتے چلے جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ بددل ہو کر اس کام کو چھوڑ نہ دیں، اور ہر تجربے کے بعد غور کریں کہ اس میں اگر آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو وہ کیا ہے اور دوسرے نے اگر ضد یا ہٹ دھرمی سے کام لیا ہے تو اسے راہِ راست پر لانے کا بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی خیال رکھیے کہ یہ کام بڑا صبر چاہتا ہے۔ جہاں آپ برائی دیکھیں اور محسوس ہو کہ اس وقت اس پر ٹوکنا مناسب نہیں ہے تو ٹال جائیے اور دوسرا کوئی مناسب موقع اس کے لیے تلاش کرتی رہیے۔ اس کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جس جگہ ایسی کوئی برائی ہو کہ اس کو ٹوکنا آپ کے لیے مشکل ہو تو وہاں سے ہٹ جائیے اور اگر کوئی صحبت یا تقریب اس قسم کی ہو تو اس سے الگ رہیے۔ ایسے مواقع پر لوگ بالعموم خود آپ کی علیحدگی کی وجہ پوچھیں گے۔ اس وقت آپ کو یہ موقع مل جائے گا کہ بڑی نرمی کے ساتھ وجہ بیان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ آپ لوگوں کو روکنا تو میرے بس میں نہیں ہے مگر احکامِ خدا و رسول کی خلاف ورزی میں شریک ہونے کی

جرأت بھی میرے اندر نہیں ہے

آپ نے چند متعین امور کے متعلق بھی سوال کیا ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ راہ چلتی عورتیں اگر بے پردہ ہوں تو ان کو وہیں روک کر سمجھانا مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک عام مصیبت ہے جس کا انفرادی حل اب ممکن نہیں رہا ہے۔ اس کو تو اب اجتماعی اصلاح کی تدابیر ہی سے درست کیا جا سکتا ہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ جن عورتوں سے آپ کی واقفیت ہے اور وہ بے پردگی کے مرض میں مبتلا ہیں ان تک احکام خدا و رسول پہنچانے کی کوشش کریں۔

جس عورت کا چلن خراب ہو اسے سمجھانے کا ایسا طریقہ اختیار کیجیے جس سے اس کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ آپ اسے بدچلن قرار دے رہی ہیں۔ نیز اسے بدچلنی کے خلاف وعظ سنانے کے بجائے پہلے اس کے دل میں ایمان اور خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اجتماع میں وہ نہ آئے تو کوئی تقریب ایسی پیدا کریں جس میں وہ شریک ہو اور اس وقت قیامت اور آخرت اور جنت اور دوزخ کی باتیں کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس دلائیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے حکم کا خطاب عورتوں اور مردوں سب کے لیے یکساں ہے، مگر عورتوں کو اپنے دائرے میں ہی یہ فرض انجام دینا چاہیے۔ ان کے مخاطب وہ مرد ضرور ہو سکتے ہیں جو ان کے رشتہ دار ہوں اور جن سے ملنا جلنا، بات چیت کرنا ان کے لیے ممکن ہو۔ عام مردوں کو نصیحت کرنا ان کا فرض نہیں ہے الّا یہ کہ وہ شائع ہونے والی تحریروں کی شکل میں یہ خدمت انجام دیں۔

اسلام اور جمہوریت

سوال: جمہوریت کو آج کل ایک بہترین نظام قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام سیاست کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بہت بڑی حد تک جمہوری اصولوں پر مبنی ہے۔

مگر میری نگاہ میں جمہوریت کے بعض نقائص ایسے ہیں جن کے متعلق میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ اسلام انہیں کس طرح دُور کر سکتا ہے۔ وہ نقائص درج ذیل ہیں:

(۱) دوسرے سیاسی نظاموں کی طرح جمہوریت میں بھی عملاً آخر کار اقتدار جمہور کے ہاتھوں سے چھن کر اور چند افراد میں مرتکز ہو کر جنگ زرگری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور PLUTOCRACY یا OLIGARCHY کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا کیا حل ممکن ہے؟

(۲) عوام کے تنوع اور متضاد مفادات کی بیک وقت رعایت محفوظ رکھنا نفسیاتی طور پر ایک بڑا مشکل کام ہے۔ جمہوریت اس عوامی ذمہ داری سے کس شکل میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے؟

(۳) عوام کی اکثریت جاہل، سادہ لوح، بے حس اور شخصیت پرست ہے۔ اور خود غرض عناصر انہیں برابر گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں نیابتی اور جمہوری ادارات کے لیے کامیابی سے کام کرنا بڑا دشوار ہے۔

(۴) عوام کی تائید سے جو انتخابی اور نمائندہ مجالس وجود میں آتی ہیں، ان کے ارکان کی تعداد اچھی خاصی ہوتی ہے اور ان کے مابین باہمی بحث و مشاورت اور آخری فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ رہنمائی فرمائیں کہ آپ کے خیال میں اسلام اپنے جمہوری ادارات میں ان خرابیوں کو راہ پانے سے کیسے روکے گا۔

جواب ۔ آپ نے جمہوریت کے بارے میں جو تنقید کی ہے اس کے تمام نکات اپنی جگہ درست ہیں، لیکن اس مسئلے میں آخری رائیں قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اوّلین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کونسا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو

رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں ؟ یا یہ کہ کوئی شخص یا گروہ خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلاتے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کار پردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو ؟ اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے تو ہمارے لیے دوسری صورت کی طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے ، اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں، ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے اگر انہیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں، تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں:

اول یہ کہ جمہور کو مختار مطلق اور حاکم مطلق (SOVEREIGN) فرض کر لیا گیا اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختارِ مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم (SOVEREIGN) نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور ان کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے

کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فردِ مسلمان میں ایمان اور احساسِ ذمہ داری (اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہوگی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور جتنی زیادہ ہوگی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار اور مضبوط رائے عام پر ہے اور اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو، ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے اس میں نہ پھل پھول سکیں۔ اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عملدر آمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے، وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد اصلاح و ارتقاء کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جمہوریت کو تجربے کا موقع ملے۔ تجربات سے بتدریج ایک ناقص مشینری بہتر اور کامل ترینتی چلی جائے گی۔

چند متفرق سوالات

سوال۔ مہربانی فرما کر میرے چند سوالات کے جوابات ارسال فرمائیے، میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

۱۔ غلافِ کعبہ خانہ کعبہ پر کس شہر کا تیار شدہ چڑھایا گیا؟ بعض لوگ کراچی کے

غلاف کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے ہیں، اور بعض لوگ لاہور کے غلاف کے متعلق اظہار خیال کر رہے ہیں۔

۲۔ بعض لوگ فرماتے ہیں کہ آپ نے مسجد نبوی میں لوگوں کے ساتھ سلام نہیں پڑھا۔ آپ سے کئی ساتھیوں نے کہا کہ آپ تشریف لائیں اور سلام پڑھیں لیکن آپ نے کچھ جواب نہیں دیا اور دعا کے بعد وہاں سے تشریف لے آئے؟

۳۔ مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے درسِ قرآن کے بند کرنے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ جبکہ حضرت مولانا تھانوی صاحب کافی عرصہ سے درسِ قرآن بلا معاوضہ نشر کرتے تھے۔ آخر ریڈیو پاکستان والوں نے کس مصلحت کے تحت مولانا تھانوی کا درسِ قرآن بند کیا۔

۴۔ سنا ہے کہ آپ کا اور مولانا احمد سعید کاظمی صاحب کا مناظرہ ہوا تھا اور فیصلہ ان کے حق میں ہوا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟

جواب ۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:

۱۔ اس سال ایک غلاف عید الفطر کے موقع پر چڑھایا گیا تھا جس میں لاہور، کراچی، اور ہندوستان کے تھان ملے جلے تھے۔ دوسرا غلاف اب حج کے موقع پر چڑھایا گیا ہے جس میں زیادہ تر لاہور کے تھان اور کچھ ہندوستان کے تھان شامل ہیں۔ کراچی کے تھان کسی ضرورت کے موقع پر کام آنے کے لیے محفوظ رکھ لیے گئے ہیں۔

۲۔ مسجد نبوی میں نماز پڑھنا اور مواجہہ شریف پر حاضر ہو کر درود و سلام عرض کر دینا میرے نزدیک کافی ہے اور یہ کام میں کرتا رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی خاص جماعت کے ساتھ کھڑے ہو کر وہاں سلام پڑھنا کب سے ضروری ہو گیا ہے۔ جس واقعہ کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک روز نماز مغرب کے بعد دمشق کے ایک مشہور عالم اور صوفی بزرگ اتفاق سے مسجد نبوی میں مل گئے۔ میں ان سے بیٹھا ہوا گفتگو کر رہا تھا کہ اتنے میں یکایک مولانا عبد الحامد صاحب

بدایونی تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ چل کر سلام پڑھو اور اس کے بعد میرا جواب سُنے بغیر فوراً واپس تشریف لے گئے۔ اب اس قصے کو مشہور کیا جا رہا ہے کہ فلاں شخص نے مسجدِ نبوی میں لوگوں کے ساتھ سلام نہیں پڑھا۔ میں حیران ہوں کہ یہ کیا فضول حرکات ہیں جن میں ہمارے دین دار حضرات اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ بلا وجہ دوسروں کے متعلق بدگمانیاں پھیلانا آخر کس قسم کی نیکی ہے اگر مسجد نبوی میں جا کر بھی دل پاک نہ ہوں اور آدمی درود و سلام پڑھنے کے وقت بھی بس یہی دیکھتا رہے کہ کس نے اسے پڑھتے دیکھا اور کس نے نہ دیکھا، تو اب کونسی جگہ ایسی باقی رہ جاتی ہے جہاں دل ان گندگیوں سے پاک ہو سکیں۔

۳۔ مولانا احتشام الحق صاحب کا درسِ قرآن بند کر دینا ریڈیو پاکستان والوں کا ایک بہت ہی افسوسناک فعل ہے۔ کوئی شخص بھی اس کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۴۔ مولانا احمد سعید کاظمی صاحب سے نہ میرا کوئی مناظرہ ہوا اور نہ مناظرے کرنا میرا شیوہ ہے۔ خدا ان لوگوں کو نیک توفیق دے جو طرح طرح کے افسانے تراشتے اور پھیلاتے ہیں۔
